غالب کی دلّی

سید ضمیر حسن دہلوی

سید ضمیر حسن دہلوی

غالب کی دلّی

"اس تصنیف پر مصنف کو اتر پردیش اردو اکاڈمی کی جانب سے
۱۹۷۷ء میں اعزاز ملا ہے"

"اس کتاب کے مضامین کا متن سنی سنائی باتوں اور غیر مصدقہ
حکایتوں پر مبنی ہے، ناموں، کرداروں، اور واقعات کی مماثلت
محض اتفاقی ہوگی جس کے لئے مصنف معذرت خواہ ہے۔ اسے
محض افسانوی اور بے اصل سمجھنا چاہئے۔"

(مصنف)

سید ضمیر حسن دہلوی
شعبۂ اردو، ذاکر حسین کالج (دلی کالج)
اجمیری دروازہ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

سال طباعت (پہلی بار) جون ۱۹۷۷ء
تعداد اشاعت " ۱۰۰۰

کتابت : محمد احسن بجنوری

طباعت: جمال پریس دہلی

ناشر: تاج پبلشرز

۷/۱۶۶ - بیری والا باغ، دھلی ۱۱۰۰۰۶

قیمت فی کاپی دس روپے

ملنے کے پتے

تاج پبلشرز ۷/۱۶۶ بیری والا باغ دہلی ۱۱۰۰۰۶

انجمن ترقی اردو (ہند) سلطان منزل شمشاد بلڈنگ علیگڈھ (یو.پی)

انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر راؤز ایوینو۔ نئی دلّی

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیئے گا
پڑھتے کسی کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

(میر)

مصنف کا تعارف

نام :- سید ضمیر حسن دہلوی

پیدائش :- دہلی ، ۴ مارچ ۱۹۴۴ء

تعلیم :- ایم - اے (یونیورسٹی آف دہلی)

کاروبار :- مدرّسی، شعبۂ اردو، ذاکر حسین کالج (دلی کالج) دہلی

تصانیف :-

۱- فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ

۲- دلّی سے دلّی تک

۳- میر باقر علی داستان گو

۴- دلّی والے

۵- مکاتیب احمد سعید

۶- غالب کی دلّی

۷- انگنا (مختصر کہانیاں) (زیرِ ترتیب)

۸- اردو کی بات گفتنی و ناگفتنی (تنقید) (زیرِ ترتیب)

جیتی جاگتی دلّی

لالہ مہیشور دیال کے نام

جمالِ ہم نشیں بر من اثر کرد
وگرنہ من ہمہ خاکم کہ ہستم

فہرست

دِلّی جو ایک شہر تھا

شخصیات :۔

انشائیے

مقدمہ

دلّی ایک شہر نہیں ایک تہذیبی روایت ہے۔ روم، اصفہان، غرناطہ، سمرقند، استنبول، بغداد اور کابل کی طرح دلّی کی عظمتِ پارینہ سے تاریخ کے صفحات بکھرے پڑے ہیں ترکوں کے زمانۂ حکومت میں علماء، فقہا، صناع اور صاحبِ کمالوں نے چار دانگ عالم سے آکر یہاں سکونت اختیار کی تو ایشیا میں کوئی شہر اس کی ٹکّر کا نہ رہا۔ مغلوں کے وقت میں بابر نے اسے نئے سرے سے بسایا تو ہندوستان کی قدیم تمدنی روایات کو ملک کے کونے کونے سے سمیٹ کر یہاں لایا گیا اور انھیں خاطر خواہ فروغ دینے کی سعی مشکور ہوئی۔ اس کے بعد جب شاہجہاں نے بڑے چاؤ چونچلے سے فصیلی دہلی یا جہاں آباد کی بنیاد رکھی تو یہ شہر جو اب ایک اُجڑا دیار کہلاتا ہے اپنے حسنِ انتظام، سجاوٹ، خوبصورتی، فن اور صناعی کے اعتبار سے یکتائے روزگار ٹھہرا۔

دلّی یوں تو بقول شخصے غدر سے پہلے ہی "اجڑا نگر" کہلانے لگی تھی، اور
غدر کے بعد اس کا رہا سہا جوبن بھی ختم ہوا، تاہم ابھی دلّی میں ایسے بزرگوں کی ایک
کھیپ موجود تھی جو اس شہر کے اگلے وقار کو آنکھوں میں بسائے، اسے دوبارہ آباد
کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ لوگ بھی رفتہ رفتہ دلّی کے ساتھ قصۂ پارینہ
ہو گئے۔ ہم نے دلّی کی شہر آبادی تو کیا اس کی پرچھائیں بھی نہیں دیکھی۔ جو کچھ
اگلے نام لیواؤں سے سنا ہے وہ میرا سرمایۂ حیات ہے۔ اس کی دھیمی پونجی یہ ہیں یہ
کہوں گا کہ میں نے دلّی کی تہذیب کا ان مضامین میں چرچا کیا ہے جو آپ کے پیش
نظر ہیں تو یہ مجھے زیب نہیں دیتا۔ میں کیا اور میری بساط کیا۔ مدعا اس تحریر کا یہ ہے
کہ دلّی کی داستان ہمارے دلوں سے محو نہ ہونے پائے اس لیے جو کچھ سنی سنائی
باتیں اور لکھا ہوا پڑھا ہے، اس پر تکیہ کر کے ہرزہ گوئی کا قصوروار ٹھہرا ہوں۔

احباب میرے اکثر مجھ سے کہتے ہیں کہ تو دلّی کی زبان بولتا ہے۔ مجھے
ہیں کہ نثر و تسنیم کی روانی اور قند و نبات کی مٹھاس ہے میں بھلا اس ضمن میں کیا عرض
کروں۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ اسے الطاف رحمانی سے تعبیر کروں
تو بجا ہے اور فیضانِ خاکِ پاکِ دہلی کا کہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ میں نے جوتیاں ایسوں
کی سیدھی کی ہیں جو طوطی صفت گویا ہوتے تو خلقت بنظر استحسان نظارہ کرتی تھی۔
شاہد احمد دہلوی صاحب، واعدی صاحب، اشرف صبوحی، مولانا احمد سعید، آغا
سید رحمن، خواجہ محمد شفیع، مرزا محمود بیگ، اور بیرسٹر نورالدین کے جو کلمات خوبیِ تقدیر
سے آویزۂ گوش ہوئے انھیں دل کے نہاں خانوں میں یوں ہی سمو لیا جیسے پھول
کی پتیاں خوشبو کو سموتی ہیں یا ارگنوں کے پردے میں سُر سما جاتے ہیں۔ اب کہ

ان بزرگوں میں سے اکثر نذرِ اقربی رحمت کے اللہ کو پیارے ہوئے، ایک مردِ خدا مہیشور دیال جی کی خدمت میں گاہ گاہ حاضر ہوتا ہوں اور عنایت ان کی سے فانوسِ دہلوی اقدار کا آنکھوں کے آگے گردش کرتا رہتا ہے۔ خدا انھیں رہتی دنیا تک سلامت رکھے اور مجھ کندۂ ناتراش کو بھی ان کی شفقت اور اپنی رحمت سے مستفیض کرتا رہے۔

امریکہ کے کسی شہر کی فلک بوس عمارتوں کو دیکھ کر ایک دانشور نے کہا تھا کہ ان عمارتوں کے مکین آسمانوں کی سرگوشیاں تو سن لیتے ہیں لیکن پیرس اور لندن میں رہنے والوں کے برعکس ان کا رشتہ زمین سے استوار نہیں ہے۔ اساطیر روایات اور تہذیب کا قوموں کی زندگی میں وہی درجہ ہے جو فرد کی زندگی میں حافظے کا ہوتا ہے۔ حافظہ باطل ہوا تو انسان محض ایک چوپایہ رہ جائے گا۔ نئی نسل کے لوگ اس قسم کی پھبتیاں کستے ہیں۔ بظاہر یادوں کا عمل بے معنی اور تضیعِ اوقات نظر آتا ہے، کچھ لوگ تو اسے مریضانہ اندازِ فکر سے تعبیر کرتے ہیں، مگر اس شغل کی معنویت کا مفہوم ان پر کھلتا ہے جو محسوس کرتے ہیں کہ یاد ہماری شخصیت کی بنیاد ہے۔ یادیں نہ ہوں تو ماضی نہیں رہتا ـــــ وہ ماضی جو جڑوں اور بنیاد کا استعارہ ہے اور جس کے بغیر حال کی اہمیت ایک مشتِ غبار سے زیادہ نہیں ہے۔

تہذیب کمہار کے آوے کی طرح انسانیت پر جو رنگ چڑھاتی ہے پختہ چڑھاتی ہے۔ تہذیب کا تعلق لطیف معروضی عقائد اور سنجیدہ ذہنی اقدار سے ہے۔ تہذیب ظاہر ہی نہیں باطن میں تبدیلیاں لاتی ہے اسی لئے تہذیب کا درس نامعتبر نہیں۔ تہذیب پائدار نہیں، زمانہ ساز نہیں۔ دلی کی تہذیب کا یہ اثر تھا کہ اس نے ہمیشہ نیک نیتی ،

بھلمنسا ہی، شرافتِ نفس اور انسانیت کو فروغ دیا۔ دلّی ایک دن میں نہیں، ایک سال میں نہیں، ایک صدی میں نہیں قرنوں میں بنی تھی اس لئے اس کا جادوئی اثر بھی دیرپا اور دائمی تھا۔ آج اس افراتفری کے دور میں ہمیں سیاسی حربوں کی ضرورت نہیں، جھوٹے وعدوں اور نظاہرداریوں کی ضرورت نہیں، ذہنوں کو یکسر بدلنے والی تہذیب کی ضرورت ہے اور وہ تہذیب، حیف! صد حیف ہمارے سامنے مٹ رہی ہے۔ فنا ہو رہی ہے۔ یہ دلّی کا المیہ نہیں، ہماری زندگی کا المیہ ہے۔ اہرام مصر کے معماروں نے اسکے ایک پتھر پر یہ عبارت کندہ کی ہو کہ ہم نے یہ عمارت مدتوں میں بنائی ہو۔ تم چاہو تو ایک دن میں مسمار کر دو۔ بڑے دُکھ کی بات ہے کہ دلّی کے گھر کوچے اور گلیاں بھی گزرتے برسوں کی طرح گزرتے چلے جاتے ہیں اور میرے نزدیک ان کے مرقعے ہماری آنکھوں میں محفوظ نہ رہے تو ہم سب کھوئے ہوئے لوگوں کے مشابہ ہو جائیں گے۔

میرے جن دوستوں نے ان مضامین کے لئے مواد کی فراہمی میں تعاون کیا، ان کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ سعید خاں صاحب ایڈیٹر "دلّی سوسائٹی"، عبدالعزیز صاحب، ڈاکٹر صلاح الدین خاں اور ہمزاد و ہمرکاب محمد نسیم صدیقی ایڈووکیٹ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات کی حوصلہ افزائی نے بالآخر یہ کام انجام کو پہنچایا۔

سید ضمیر حسن دہلوی

۲۷ مئی ۱۹۷۷ء

غالبؔ کی دِلّی

انیسویں صدی کے شروع کا زمانہ ہے۔ شاہ عالم از دلّی تا پالم، لال حویلی میں براجمان ہیں۔ اپنی عجز رسی اور دکنیوں کی خدماتِ شائستہ سے خزانے کی حالت انھوں نے خاصی سدھار لی ہے۔ تختِ طاؤس بھی بنوا لیا ہے۔ دنیا کی طرف سے آنکھیں موندے، دیکھی کو اَن دیکھی کیے اور سُنی کو اَن سُنی کیے صبر شکر سے بیٹھے ہیں۔ قلعے میں جہاں پناہ کا دور دورہ ہے، باہر نائب پیشوا کی باندھی بندھتی اور کھولی جاتی ہے۔ خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم پائیوں کا ہے۔ دِلّی بکھری پڑی، اور شاد آباد دکھائی دیتی ہے۔ تخت اُلٹ گئے ہیں، بلندی پارہ گئی ہے، ہاتھی لٹا لٹایا پھر بھی سوا لاکھ کا۔ شاہجہاں کی دلّی کے آثار ابھی باقی ہیں۔ آسمان سے باتیں کرتے حویلیوں کے پھاٹک، جن کے کواڑوں پر پیتلی، کنول میخیں ٹھکی ہیں۔ رتھ، بہلیاں، تانگے، منجھولیاں، ہوادار، تامجھام، پالکیاں، تختِ رواں، سکھپال

پینڈول، مہاڈول، نالکیاں، ہاتھی گھوڑے، امیر امرا، بناؤ سنگھار کیے، مرقع بنے خدم حشم کے ساتھ، نقیبوں کی آواز کڑکیوں کے کڑکے، چوبدار، ملازم آگے بردار، مردے سب جوں کے توں سلامت ہیں۔ گلی کوچے بارونق، بازار کشادہ، سجے سجائے یوں کھچا کھچ آدمیوں سے بھرے ہیں کہ تھالی پھینکیے تو سروں پر چلے۔ رات کو سواری نکلتی ہے تو مشالچی مشالیں لیے، ایک ہاتھ میں مشال دوسرے میں تیل کی بھری کپی، تیل ٹپکاتے چلے جاتے ہیں۔ مشالوں کا دھواں اٹھتا ہے تو اپنی خوشبو سے فضا کو معطر کر دیتا ہے۔ کہاروں کی ہنکاروں، چوبداروں کی ہٹو بچو، کی صداؤں سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ اس زمانے کی دلی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو رستم، افراسیاب، جمشید اور کیقباد سمجھتا ہے۔ ناک چوٹی کتر نتار دلی والیاں باہر والیوں پر ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔ ایک ایک کے خاندان کے گڑے مردے اکھاڑے جاتے ہیں، نسلوں میں بنی نکلتی ہے۔ سات سات پشتیں گنی جاتی ہیں۔ دلی کے لونڈوں کے امیروں میں "نو دولتیا" گالی کے مترادف ہے کسی کو سمرقند کا زرگر، کسی کو بخارے کا سقہ، کسی کو لونڈی بچہ سمجھی نہ سمجھا، کسی کو قارورہ دیکھنے والا کسی کو کاتن کا جنا کہتے ہیں۔ غرض اپنے ٹکر کا کسی کو نہیں سمجھتے۔ لٹی پٹی دلی ابھی تک مدینۃ الامرا بنی ہوئی ہے۔ ایک ایک بیٹھے سے جھیلن جھیلن پالکیاں امیروں کی اور ان کے چیلوں کی نکلتی ہیں۔ غرض یہ کہ جدھر دیکھیے رونق ہی رونق دکھائی دیتی ہے۔ نگینیاں بکھری پڑی ہیں۔ دن عید رات شب برات معلوم ہوتی ہے۔

اس وقت مرزا نوشہ سات برس کا سن گلبدن کی تنبان، چندیری کا ننھا سا جامہ، گوٹے کی ٹوپی، بھیا، ننھی جان، اگر کھرد، کرن، تونی ٹکی اوڑھے، زردوزی کی کفش پہنے، پیاری پیاری صورت، اس دلّی میں آن کے اپنی چچی کے میکے قاسم جان کی گلی میں اترے ہوں گے ان کے ہم عمر بچوں نے جب مرزا کو اکبرآبادی لہجے میں باتیں کرتے سنا ہوگا تو کیسے ہنسے ہوں گے، کیسا انھیں بنایا ہوگا۔ دلی کا بچّہ بچّہ باہر والے کو ہیٹا سمجھتا تھا۔ اپنے رہن سہن، بات چیت گفتگو، طور طریقے اور ناز نخرے میں آپ ہی آپ تکتا تھا۔ ذرا کسی کے منھ سے کوئی فقرہ غلط نکلا بچے نے کھیلتے کھیلتے ٹوکا کہ یا کوئی اور بات خلاف وضع کی تو دلی کے بچّے بھی برا مانتے تھے۔ سچ ہے مچھلی کے بچّے کو تیرنا کون سکھائے! ان دنوں قلعہ تہذیب کا مرکز تھا اور بادشاہوں کی خو بو اس شہر کے رہنے والے چھوٹے بڑے، امیر غریب سب میں سرایت کر گئی تھی۔ مرزا ان بچوں کے ساتھ آنکھ مچولی، چنی منی کا پہاڑ، دا سرنگ لال گھوڑی، کاٹھ کٹولی، کوڑی جگن مگن، اندھا بھینسا، کوڑا جمال شاہی پیچھے دیکھو مار کھائی، بھیل جھپٹا، چادر چھپول کھیلے ہوں گے۔ کچھ دن دلی میں رہ کر اور دلی کی پیاری تہذیب و شائستگی کا رعب اپنے ننھے سے دل میں لے کر واپس ننھیال گئے ہوں گے۔

کچھ عرصے بعد مرزا کی شادی خانہ آبادی نواب الٰہی بخش معروف کی دختر نیک اختر سے ہوئی تو غالباً اسی مکان میں وہ دولہا بن کر آئے شادی کر کے مرزا آگرے چلے گئے اور پھر جب مستقل اقامت کے لیے دہلی آنا ہوا تو ان کی عمر بیس بائیس برس کی ہوگی صورت دیکھنے دکھانے کے لائق تھی۔ کتابی چہرہ

سبزہ رنگ، خوب صورت بتیسی، دانتوں پر مسی، دہرا بدن، کشیدہ قامت، ابھی ہاڑ چوڑے
دہے کی بجائے پایانچ مشرد کا تنگ موری کا پاجامہ، جامہ وار کی چپکن اور اس پر
نیم آستین۔ نوک دار کفش۔ مرزا کی یہ وضع شہر آبادی تک رہی۔ ان کا دل آتے ہی
دلّی میں لگ گیا۔ مولوی امام بخش صہبائی۔ میاں نصیر الدین کالے صاحب۔ مفتی
صدر الدین آزردہ، حکیم احسن اللہ خاں، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی صحبتیں میسر آئیں۔
دلّی میں اب پہلی سی رونق تو نہ تھی۔ آلِ بابر کی عظمت و سطوت کے نشانات روز
بروز دھندلے ہوتے جاتے تھے۔ تاہم مغل عہد کے اس دورِ آخر میں دلی کے اندر
علماء، شعراء، ادباء کا ایک ایسا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا جسے دیکھ کر دربارِ اکبری کے نورتنوں
اور عہد شاہجہاں کے جواہر پاروں کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ قلعہ اس وقت کی ادبی
انجمن تھی، اور غالب بھی کبھی کسی نہ کسی تقریب میں وہاں ضرور گئے ہوں گے۔ اکبر شاہ
ثانی تخت نشین تھے۔ شہر میں دور دورہ انگریزوں کا تھا۔ قلعے میں دربار بادشاہ کا،
اور شہر میں دربار صاحب کلاں کی کوٹھی پر لگتا تھا۔ اب "خلقِ خدا کی ملک بادشاہ
کا اور حکم کمپنی بہادر کا" تھا۔ اس زمانے کی دلّی کا یہ عالم تھا کہ سلطنت کو گھن لگ
چکا تھا۔ اکبر شاہ ثانی چولھے آگ نہ گھڑے پانی" بچے بچے کی زبان پر تھا۔ دبیا و حریر کے
پردوں میں ڈھکے جسموں کی حرارت مدھم پڑ چکی تھی، مگر دلّی والوں پر ایک گونہ بے خودی
طاری تھی۔ وہ فکرِ فردا سے بے خبر ماضی میں کھوئے ہوئے زندگی کے رس کا آخری قطرہ
نچوڑنے میں لگے ہوئے تھے۔ رزم کی سکت تو مدت پہلے ختم ہو چکی تھی، بزم ہی بزم
رہ گئی تھی۔ اگلی دولت کی فراوانی نے پہلے ہی اس بزم آرائی کے خط و خال میں
نفاست اور نزاکت بھر رکھی تھی۔ اب اسی میں لذت اور تعیش کا رنگ بھر کر

دلّی والوں نے اسے خود فراموشی کا بہانہ بنا لیا تھا۔ اسی زمانے کی دلّی کے لیے کہا گیا ہے کہ یہاں آٹھ دن، نو میلے تھے۔ روز ایک نت نیا تہوار منایا جاتا، ہنسنے بولنے کے بہانے ڈھونڈے جاتے تھے۔ پیر فقیر کی نیاز نذر کے نام سے حلوے مانڈے اُڑائے جاتے تھے۔ عرس، فاتحہ تک عقیدت مندی کا مظہر کم اور تفریحی آلہ زیادہ بن گئے تھے۔ بیسیوں عرس ہوتے تھے۔ ہفتوں پہلے تیاریاں ہوتیں۔ مزار کے آس پاس دُکانیں سجتیں اور کثرتِ چراغاں و قندیلوں سے جنگل میں منگل منائے جاتے تھے۔ خلقت جس میں امیر غریب، مرد عورت، بوڑھے، جوان سبھی شامل تھے، کھنچ کر وہاں پہنچ جاتی تھی۔ امیر پھولداریاں لگاتے اور ڈیڑھ دس کے مکان کرائے پر لیتے تھے۔ بہتوں نے تو اسی مقصد کے لیے ذاتی مکانات مہرولی اور نظام الدین میں بنوا رکھے تھے۔ غریب پیڑوں تلے ڈیرا جماتے تھے۔ کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے اور وہیں خاندان بھر کی بستی بسا لیتے تھے۔ مزاروں پر قوالیاں ہوتیں، نذریں چڑھائی جاتیں، گلاب پاشی ہوتی، طوائفوں کے رقص ہوتے اور یارانِ زندہ دل جی بھر کر رنگ رلیاں مناتے تھے۔ یہ عرس اور میلے اس زمانے کے دلّی والوں کو جان سے زیادہ عزیز تھے۔ معاشرے کے ٹوٹتے تننے کی کسلمندی دُور کرنے کے لیے یہ چند جرعے صبوحی کی حیثیت رکھتے تھے۔ وارفتگیِ شوق نے مذہبی رسوم، موسمی تہواروں اور شادی غمی کو تفریحات کا بہانہ بنا لیا تھا۔ رمضان، عید، شب برات، محرم، آخری چہار شنبہ، بارہ وفات، گیارھویں شریف، خواجہ صاحب کی چھڑیاں، رجب کے کونڈے، بسنت، دسہرہ، دیوالی، ہولی، پنکھوں کا میلہ، پھول والوں کی سیر سبھی زور شور سے منائے جاتے تھے۔

اکبر شاہ ثانی کا انتقال رات کے دو بجے ہوا۔ خبردار دم بدم کی خبر ولی عہد کو دے رہے تھے اور ولی عہد تاج اور لباس اور زر و جواہر اور زیور کا خوان لیے بیٹھے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ میں کب یہ سنوں کہ گھی کا کپا لنڈھ گیا اور تخت بادشاہی پر جا بیٹھوں۔ چنانچہ ایک خبردار نے خبر دی کہ حضور مبارک، ہو مسافر گیا۔ بس فوراً ولی عہد بہادر نے شاہانہ لباس پہنا اور چاہا کہ تخت پر قدم رکھیں، جو نجومی اور جوتشیوں نے کہا کہ وقت اچھا نہیں ہے، سورج نکلے جلوس فرمائیے گا۔ اندھیرے میں، تخت پر بیٹھنا نحس ہے۔ ولی عہد نے کہا میرے لیے نحس ہے یا رعایا کے لیے؟

نجومی کہنا تو یہ چاہتے تھے کہ دونوں کے لیے برا ہے، مگر ولی عہد کے ڈر سے کہہ دیا کہ حضور رعیت کے لیے اچھا نہیں۔ ولی عہد نے کہا خیر دیکھا جائے گا۔ آفتاب نہ ہوگا تو کیا روشنی نہ ہوگی اور مشعل و مہتاب اور شمع و چراغ کی ایسی روشنی ہوئی کہ دن نے مات کھائی۔ ولی عہد تخت پر بیٹھے۔ ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ثانی، لقب اختیار کیا۔ ان کے تخت پر بیٹھتے ہی کال پڑا۔ سارا ہندوستان تراہ تراہ پکارنے لگا۔ آگرے کی طرف سے گیہوں ناؤ میں بھرا ہوا کئی ہزار من آرہا تھا۔ جب ناویں لال قلعے کے پاس کنارے پر لگیں۔ اس سے پہلے کہ اناج کی بوریاں کھاری باولی پہنچائی جائیں کنگلوں اور بھوکوں نے لوٹ لیں۔ دلی کی عورتوں میں اس کی بھی یادداشت بن گئی تھی۔ ایک سے دوسری کہتی کہ "بوا، جب ناویں لٹی تھیں تو میں بارہ برس کی تھی!" آخر یہ بے وقت کی تخت نشینی اپنا رنگ لائی اور شاہجہان آباد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، سلطنت اجڑ گئی۔ لال قلعہ [illegible]

ڈھانچہ رہ گیا۔ نام و نمود کا پانی ملتان بہہ گیا۔

دلّی والوں کے لاکھ بُرے دن آ گئے تھے، مگر ان کے اخلاق، وضعداری، مہمان نوازی، اور برتاؤ میں سرِ مو فرق نہ آیا تھا۔ اس راز کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کی قسمت کا ستارا بامِ فلک سے یکبارگی ٹوٹا ہو۔ دَورِ آخر میں جو یورپین سیاح دلّی آئے، انھوں نے اپنے سفرناموں میں اہلِ دہلی کے اخلاق اور مہمان نوازی کا اعتراف کیا ہے۔ صاحبِ خانہ بڑی تعظیم و تکریم سے مہمان کو دیوان خانے میں، جو زنانہ مکان سے علٰحدہ ہوتا، لے جاتا تھا، اور پھر خادم یا وہ خود مہمان کے آگے عطرِ گلاب، پھلوں کی قاب اور خشک میوے کی پلیٹ رکھتا تھا بعد میں پان کی گلوریاں یا صرف الائچی پیش کی جاتی تھی۔ غدر کے ہنگامے تک دلّی والوں نے شاہجہاں آباد کے تہذیبی ورثے کو سینے سے لگائے رکھا اور پرانی روایات کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کرتے رہے، اس زمانے میں رکھ رکھاؤ اور خاندانی عزّت و آبرو کا بڑا خیال کیا جاتا تھا۔ لوگ عہد کے پکّے اور قول کے دھنی ہوتے تھے۔ جس نے جو کہہ دیا، جو وضع اختیار کر لی اُسے مرتے دم تک نبھانا لازم ہو جاتا تھا۔ بدمعاشوں تک کی زندگی کے ضابطے اور اصول تھے۔ جرم اور شرافت ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ حلال خور، جبار، کنجڑے قصائی، سب اپنے اپنے درجے میں شریف ہوتے تھے۔ دلّی میں منّتوں، مُرادوں کا بڑا زور تھا۔ درگاہوں میں چلّے چڑھتے، مسجدوں میں طاق بھرے جاتے۔ بچّوں کے گلوں میں اللہ آمین کے گنڈے ڈالے جاتے، جینے کے لیے طرح طرح کی منّتیں مانی جاتی تھیں۔ کوئی شاہ مدار کے نام کی چوٹی رکھتا تھا، کسی کے کان میں بالی پڑ دی جاتی تھی۔

اور کوئی حسینی فقیر بنتا تھا۔

عوام اور خواص کے مشاغل ڈنڈ، مگدر، بانک، بنوٹ، پنجہ کشی، تیراکی، شکرے اور باز کا شکار، پتنگ بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی، بلبل کی پالیاں شطرنج، چوسر، گنجفہ، سب دہلی کے انحطاطی دور میں جوں کے توں برقرار تھے۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ ان فنون کے عروج کا زمانہ یہی تھا۔ دلی والوں کے پاس رہا ہی کیا تھا ایک یہی دولت تھی اسے وہ کیوں کر ہاتھ سے جانے دیتے؟ ہر شخص اپنے تئیں کسی کمال میں یکتا بننے کی کوشش کرتا تھا۔ اس زمانے میں آدمی اپنے حسب نسب، پیشہ اور شغل کے مطابق لباس پہنتا تھا۔ آج کی سی بات نہیں تھی کہ جسے دیکھیے ایک ہی وردی پہنے پھرتا ہے۔ درباری اور بازاری لوگ لباس سے پہچانے جاتے تھے، عمر کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اگر جوان ہے تو ایک ایک ٹانکے پر جوانی برستی ہے۔ بوڑھا ہے تو پیری اور سادگی ٹپکتی ہے۔ بانکوں کا بانکپن، چھیلوں کا چھیلاپن، ملاؤں کی ملائی، پہلوانوں کی پہلوانی، رذالوں کی رذالت اور شریفوں کی شرافت لباس سے بھانپ لی جاتی تھی۔ چھوٹے آدمی جس پوشاک اور وضع قطع کو اختیار کر لیتے اُسے بھلے مانس چھوڑ دیتے تھے۔ اسی بنا پر ناکسوں نے داڑھی رکھی، تو سر منڈوا دیا تھا۔ دو پلڑی ٹوپیوں کا رواج تھا مگر چوگوشی، پنج گوشی، مغلئی، تاجدار ٹوپیاں مغل بچے اور شریف زادے پہنتے تھے۔ قلعے کے آنے جانے والے بنارسی دوپٹہ اور گوٹے دار پگڑیاں پہنتے تھے درباری جامہ بھی پہنا کرتے تھے۔ امرا چغہ اور سرپیچ استعمال کرتے تھے، ہندو دولہا میں پہلے جامے کا دستور تھا، پھر نیم جامہ اور الٹی چولی کے انگرکھے پہنے جانے

لگے۔ علاوہ ازیں اچکن، قبا، مرزئی بھی استعمال ہوتے تھے۔ پاجامے یا تنگ مہری کے، یا غرارے یا ایک برے ہوتے تھے۔ امرا، سیٹھ ساہوکار رنگ برنگ کی شالوں سے کمر کسے رہتے تھے۔ محلے ہموار اکثر مکان کچھ اس وضع کے ہوتے تھے کہ باہری حصے میں ڈیوڑھی اور دیوان خانہ ہوتا تھا، اندرونی حصہ میں دالان در دالان ہوتے تھے۔ سامان رکھنے کے لیے بغلی کوٹھریاں ہوتی تھیں۔ صحن بہت بڑا اور عموماً کچا ہوتا تھا۔ کھاتے پیتے گھروں میں چھوٹا سا باغیچہ ہوتا تھا، اور متوسط لوگوں کے گھروں میں کچھ نہیں تو بیری یا انار کے درخت ضرور ہوتے تھے۔ شہر محلوں میں بٹا ہوا تھا۔ محلے بہت گنجان آباد تھے۔ ان کی گلیاں اور کوچے تنگ، پیچ دار اور زیادہ تر کچے ہوتے تھے، چراغ جلے گلیاں سنسان ہو جاتی تھیں۔ محلے والے اپنے محلے پر بڑا ناز کرتے تھے اور محلے کے غریب اور نادار لوگوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ غرض ہر طرح کا رکھ رکھاؤ، بھاری بھرکم انداز جینے کا حوصلہ اور سلیقہ اس زمانے کے دلی والوں میں اپنی معاشی اور سیاسی بدحالی کے باوجود پایا جاتا تھا اور لوگ باد مخالف کی تند و تیز آندھیوں میں پگڑی سنبھالے ہوئے تھے

مروت، محبت، وضع داری، صلح و آشتی اور سلیقہ مندی کا یہ انداز فلک تفرقہ پرداز کو دیر تک نہ بھایا۔ سیاسی بساط تو پہلے ہی درہم برہم ہو چکی تھی، اب مجلسی اور ثقافتی زندگی بھی تباہ ہو گئی۔ غالب کا یہ حال کہ گھر سے جھوٹا لگا، کانوں سے بہرے، بڈھے پھونس، یہ افراتفری اپنی آنکھوں سے دیکھا کیے شہر کھد کھدا کر برابر ہو گیا۔ جو گھر، حویلیاں اور محل سرائیں تھیں، زمین ساز

کر دی گئیں جہاں دنیا اُمڈی پڑتی تھی اور چلنے کو راستہ نہ ملتا تھا اب وہاں ہُو کا میدان ہو گیا۔ ہر طرف کُدال پھاوڑے بجنے لگے۔ عجیب ویرانی اور پریشانی کا عالم تھا۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر، دلی کا نام و نشان مٹ گیا۔ چُن چُن کے امراء اور شریف زادوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ غالب کو مغلوں کی تہذیبی بساط الٹ جانے کا بڑا غم تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں وہ اسے ایک بہت بڑا سانحہ سمجھتے تھے۔

مئی ۱۸۵۷ء دوپہر دن چڑھے وہ فوج باغی میرٹھ سے دلی آئی تھی یا قہر الٰہی بے بہ پے نازل ہوا تھا۔ بقدرِ خصوصیت دلی ممتاز تھا ورنہ سرتاسر قلمرو ہند میں فتنہ و بلا کا دروازہ باز تھا۔ انہدام مساکن و مساجد کا حال کیا گزارش کروں۔ بانئ شہر کو ہرگز وہ اہتمام مکان بنانے میں نہ ہو گا جو ابیان ملک کو ڈھانے میں ہے۔ اللہ اللہ قلعے میں اکثر اور شہر میں بعض بعض وہ شاہجہانی عمارتیں ڈھائی گئی ہیں کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں بلکہ شہر میں قوائی آلات سے کام نہ نکلا۔ سرنگیں کھودی گئیں اور بارود بچھائی گئی اور مکانات سنگین اڑا دیے گئے۔

غالب اگلے بارہ برس تک "اس اُجڑے دیار" کی ایک ایک اینٹ کو حسرت سے دیکھتے رہے۔ مرے ہوؤں کا ماتم کیا۔ بچھڑے ہوؤں کو یاد کر کے روئے، اپنی موت کی آپ دعائیں مانگیں، آخر تین اوپر ستر (۷۳) برس کی عمر میں انھیں اس بندی خانے سے رہائی کا حکم ملا اور وہ اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ او لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

(غالب صدی پر)

ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ مرنے کے بعد جسے شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل ہو وہ ایک عظیم انسان سمجھا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ جس نے مرے پیچھے شہرت پائی، ذلت اور خواری اُٹھائی چنانچہ پندرھویں فروری ۱۹۶۹ء کو ایک تیسرا جنم غالب کو ملا۔ خدا جانے یہ ناکردہ گناہوں کی حسرت پہ ملی داد تھی یا ضدواں سے لڑائی کا نتیجہ تھا۔ بہرکیف اس عالمِ ارواح کے گناہگار کو ایک بار پھر عالمِ آب و گل میں روبکاری کے لیے بھیجا گیا۔ دوسرے جنم میں ہی دوست، احباب، مونس، غمخوار، ہم سخن و ہم زبان نہ رہے تھے، تیسرے جنم میں تو کوئی صورت آشنا تک نہ ملا۔ میر مہدی مجروح و ہرگوپال تفتہ کہاں، نظام الدین ممنون و آزردہ کہاں، مومن خاں مومن و شیفتہ کہاں۔ نہ وہ بلیماران کی حویلی کہ دیوان خانے میں بیٹھے دوستوں کی راہ تکا کیجئے۔ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف مرزا آئے۔

وہ میرن صاحب آئے۔ نہ قلعے کے مشاعرے، نہ ذوق سے چشمکیں، نہ شبِ ماہتاب میں پچھلے پہر تک شغلِ نائے نوش، لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ قاسم جان کی گلی، رائے مان کا کوچہ، قابل عطار کا کوچہ، نیل کا کٹرہ سب کے نام موجود، بسنے والے معدوم، جو لوگ، اس ہیچ پوچ، بوڑھے اپاہج، آنکھوں سے اندھے، کانوں سے بہرے، ناتواں، نیم جاں، خلق کے مردود، خدا کے مقہور، نکبت میں گرفتارِ رہینِ رنج و آزار غالب کو پہچانتے تھے، ان میں سے ایک نہ رہا۔ ہائے ہائے لسان الغیب نے کیا خوب پیشین گوئی کی تھی ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

یہ لوگ جو غالب، غالب پکارتے ہیں، ایک طرح کے بت پرست ہیں۔ وائے محرومیٔ قسمت کہ ان کی نگاہِ حقیقت ناشناس نے اپنی تسکینِ خاطر و ذوقِ بادیہ پیمائی کے پیچھے عاقبت کے دشمن۔ آوارگی کے آشنا۔ بے جان و بے قالب اسد اللہ خاں غالب کو تاکا۔ سو انھیں بھی یہ شکایت تھی کہ نظم و نثر ایثار و کرم کے جو دواعی خالق نے ان کی سرشت میں ودیعت کئے تھے ان کی داد بااندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا۔ ہاں اگر کچھ داد ملی تو روح القدس سے ملی، سو وہ ان کا ہم زبان نہیں، نہ سخنوری نہ سخندانی، کس بھتے پر تتا پانی لیجئے سلجوقی و افراسیابی، ایرانی نژاد، فارسی داں، ریختہ گو، غزل کے استاد، یک فنے۔ یکتائے زمانہ، انانیت کے قصر میں رہنے والے، ہم جنس کے ہم عصروں کو برا کہنے والے، اب تو جی خوش ہوا۔ آفریں آفریں کی صدا کانوں میں آئی، خوب واہ واہ ہوئی۔ داد و تحسین کے ڈونگرے برسے۔

اجی حضرت چپ کیوں ہو، کچھ تو بولو، کچھ تو اُکسو۔ بولیں کیا دوسروں کو نام دھرتے تھے کہ بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا۔ اب جو خود دربارداری کرتے ہیں، آزادگی، خودبینی وخود آرائی سب ختم ہوئی، تو کس منہ سے بولیں، وہ جو دوسروں کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود دَر دَر بھیک مانگے، وہ یہ ہیں۔ اگلی سی جولانیٔ طبیعت زبان کی تیزی وطرّاری، شگفتگیٔ مزاج خیر سے اب کہاں، یہ بھی یاد نہ رہا کہ دو ہزار بیت کا ایک دیوان اُردو میں کہا تھا اور کچھ مکتوب اپنے شاگردوں، دوستوں بزرگوں اور احباب کو لکھے تھے سو بطور سند وشہادت آج تک موجود ہیں۔ بادشاہ دہلی کے لیے سکّہ کہنا اور بات ہے کہ کہا اور مکر گئے، مگر یہ کئی ہزار ابیات فارسی کی اور اُردو کی، غزلیں، قصیدے، مرثیے، تقریظیں، تاریخ، تنقید، اور مکاتیب جو حضور کی صریر خامہ سے وجود میں آئے، کاغذی پیرہن پہنے شوخیٔ تحریر کے فریادی ہیں، انھیں کیونکر جھٹلایئے گا۔ یہ کہنے سے تو نجات ہوگی نہیں کہ بستراہ بستر ہو گیا ہوں، اپنا کلام جو کچھ کہا تھا، اب یاد نہیں، حافظہ باطل ہوا۔ ستر برس سے زیادہ عالم رنگ و بو میں رہا، کہاں تک جیوں گا۔ اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے۔ کیا خوب نواب الٰہی بخش معروف نے کہا ہے ؎

آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

یاد کیجیے، آپ نے فرمایا تھا۔ "خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں"۔ سو یہ حسرتِ دیرینہ آپ کی اب پوری ہوئی۔ راج گھاٹ جہاں آپ ایک بار بیٹھے پانی کے کنوئیں کی تلاش میں گئے تھے اس سے کوئی سات آٹھ کوس اُدھر بستی جامعہ نگر ہے اور اس میں ایک ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔ اسم بامسمّٰی

بس اسی در پہ اب آپ، دائم پڑے رہیں۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک طور زندگانی ہے۔ مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے۔ یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے۔ کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے۔ تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد۔ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں۔ قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں۔ ع

کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

حضرت آداب!

اجازت ہو تو کچھ حال اس دیارِ مردم آزار کا بھی لکھوں جہاں آپ نے قحطِ غمِ الفت کی بدولت بے رزق جینے کا ڈھب سیکھا تھا۔ مرزا صاحب، آپ نے مراسلے کو مکالمہ بنایا تھا۔ میں نے اسے مکاشفہ بنا لیا ہے۔ ہزار کوس پہ بیٹھے، بنگاہِ قلم نظارہ کیا کیجیے۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کیجیے۔

ع: چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل۔ چاندنی چوک کو فرنگی مارکیٹ کھا گئی۔ جامع مسجد کی چوک ایک گلزارِ نشاط افزا ہوا چاہتی ہے۔ قلعہ آپ کے وقت سے کیمپ ہے چھاؤنی ہے۔ جمنا کی سیر پہلے بیلے کا میلہ ہوئی۔ پھر موقوف، البتہ پھول والوں کی سیر اب بھی ہوتی ہے۔ بجرے چھوٹتے ہیں۔ جہاز محل میں کھیل تماشے ہوتے ہیں، جھرنوں میں گدائیاں ہوتی ہیں۔ جوگ مایا جی کے مندر اور قطب صاحب کے مزار پہ پنکھے اور چادر بھی چڑھائی جاتی ہے۔ مگر یہ سب، عینیت ہے حقیقت نہیں۔ ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ چاہِ بے آب ہے،

ابر بے باراں ہے، خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے، ہائے دلّی، وائے
دلّی، بھاڑ میں جائے دلّی۔

ہو آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

غلامِ ساقیٔ کوثر و بندۂ ابی طالب پر الزامِ کفر و الحاد ہے۔ اس کی
شراب نوشی و نظر بازی کے چرچے کر کے زمانہ شاد و بامراد ہے۔ "ایک گونہ
بیخودی مجھے دن رات چاہیے"، کہ باور کرنے والے مشکل سے چند ہوں گے۔
ابتدائے سنِ شباب میں جو ایک درویشِ کامل نے نصیحت کی تھی کہ خوب
کھاؤ، پیو، عیش کرو، مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، اور اس
نصیحت پر آپ کا عمل بھی رہا تھا۔ کبھی کسی ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھا، کبھی کوئے
ملامت ہی کو ہو آئے، اس کا گھر گھر تذکرہ ہے۔ عشقِ خانہ ویراں ساز، لذتِ
ریشِ جگر، جاں بدستِ دگرے دادن و حیراں بودن۔ دلِ ہر قطرہ ہے سازِ
انا البحر کو منجملہ آشفتگانِ غالب سب نے بھلا دیا۔ زخم نے داد نہ دی
تنگیِ دل کی یارب ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

دیکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف، دلّی کا مال و متاع جو
کچھ تھا لُٹ کر پنجاب پہنچا۔ آپ کا سرمایۂ حیات پانی پت میں انصاریوں کے
محلّے کے رہنے والے ایک شخص کے ہاتھ آیا اور آپ نے اسے بجل بھی کیا تھا۔

وہ ایک پشتارہ بن پھیر دلی لوٹا ہے۔ ایک آپ کی جانِ حزیں اور اس قدر رنج و آلام کی یورش۔ مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں۔ ایک لشکر اربابِ اقتدار کا، ایک ادب دوست حضرات کا۔ ایک لشکر شعرائے کرام کا۔ ایک لشکر گورے غیر ملکیوں کا، اور اک لشکران پنجاب کے تماشائیوں کا۔ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے۔ مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے۔ کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک۔ میں کہتا ہوں بھائی میری کیفیت کا کاغذ الگ لکھو، سو اس کی شنوائی نہیں ہوتی، توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے۔ وہ دن گئے جب تحسینِ ناشناس سے گھبرا کے آپ نے فرمایا تھا:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

اب آپ اپنا نام غلط سنیئے، اپنے اشعار غلط دیکھیے۔ سر پھوڑیئے۔ ماتم کیجئے، میں ہوں اپنی شکست کی آواز۔ آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے، بچھائے۔ مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا۔ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور۔ ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

اللہ اللہ انسان کے جوہرِ اصلی اور کمالِ واقعی سے سرتاسر انحراف کیا جائے اور فروعاتِ کم مایہ کو ایک عالم سراہے۔ اس سے بڑھ کر ستم کیا ہو سکتا۔ شاہجہاں آباد میں ریختہ کے استاد کا جشنِ صد سالہ ہو اور ریختہ خود

شکست و ریخت سے دوچار رہے۔

یارب مجھے زمانہ مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

یہ فلکِ پیر نے طرزِ ستم ایجاد کیا ہے۔ میاں ہم اچھے ہیں یا بُرے ہیں، جو کچھ ہیں کمیاب ہیں۔ نایاب ہیں۔ یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ، اب کچھ دن میں فسانہ ہو جائیں گے۔ خدا جانے بُرے ہیں یا بھلے، صحبت مخالف ہے۔ اگر گل ہیں تو گلخن میں، اگر خس ہیں تو گلشن میں ہیں۔ ہیں دلی پوشیدہ اور کافر کھلے، آپ کو محض اہلِ بینش و گرہ کشائے عقدہ ہائے مشکل ہی نہیں جانتے بلکہ آپ کی بزرگی، برگزیدگی اور صفائے قلب کے بھی قائل ہیں۔ ہم میں اور آپ میں ایک نسبت باہمی ہے۔ قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر۔ دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں۔ جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا۔ ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

سنو صاحب! یہاں والوں کی باتیں تو یہاں والے جانیں، ہمیں ان سے کچھ سروکار نہیں۔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے، حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو۔ یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز۔ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا۔ البتہ آرزو کرنا آئینِ بندگی کے خلاف نہیں۔ میری آرزو یہ ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں، اور اگر رہوں تو کم از کم بقیہ ہوش نہ رہوں۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اُس کی دیکھا چاہیے

بھائی، اس معرض میں، مَیں بھی تیرا ہم طالع ہوں۔ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ۔ غالبؔ کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے۔ ہے خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے۔ ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا۔

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

غالب کے نام ایک خط

کیوں صاحب کیا عالمِ بالا کے پاک نہادوں کو یہ حکم ہوا کہ ہم خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں، بھلا ایسا ہوتا تو یہاں بھی منادی کرائی جاتی اور ہم، جو بعد اشتیاق بیٹھے گھڑیاں گن رہے ہیں کہ اب ڈاک کا ہر کارہ آئیگا، غالبِ شیریں بیاں کا تفقد نامہ لائے گا، اس باب میں مایوس ہوجاتے کہیں اور دل لگاتے، بندہ پرور یہ بے اعتنائی خوب نہیں، ہمارے دل کو مرغوب نہیں۔ ستر بہتر برس عالمِ رنگ بو میں رہے، دوستوں سے دوستداری اور ہم جنسوں سے مروت کا سلوک کیا۔ اب جو بہشت کے مزے اڑاتے ہو، حور و قصور ملے ہیں، شرابِ طہور سے دل شاد اور بامراد ہے تو ہمارا خیال بھی نہیں آتا۔ اللہ اللہ یا وہ تلوّن مزاجیاں تھیں کہ تلوا ایک جگہ ٹکتا ہی نہ تھا یا اب یہ عالم ہے کہ اقامت جاودانی سے جی تک نہیں گھبراتا۔ وہی زمردیں کاخ، وہی طوبیٰ کی شاخ، چشم بد دور، وہی ایک حور، بھائی ہوش میں آؤ۔

کہیں اور دل لگاؤ۔

مرزا صاحب! ہماری آپ کی دید وا دید تو ہے نہیں، اگلوں کی زبانی سُنتے آئے ہیں کہ آپ بڑے طرحدار آدمی تھے، جیتے جی سینکڑوں زخم کھائے مگر حرفِ شکایت زبان پہ نہ لائے، گھر لٹا تو رہزن کو دعائیں دیں۔ آبلہ پائی میں دشتِ پُرخار کو دیکھ کر ذرا نہ گھبرائے۔ طاعت و زہد اس لیے نہ اختیار کیا کہ اس میں اندیشۂ خود نمائی تھا۔ منصور صفت ہر قطرۂ خوں "انا الحق" پکارا کیا تو بھی ولی کہلوانا نہ گوارا کیا۔ کافر کہلائے، ملحد کہلائے اور کوچۂ ملامت میں اننار کے تار بجائے منصبِ شیفتگی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ دخترِ رز جو منہ کو لگی تو ساری عمر اس کا ساتھ نبھایا، وفاداری بشرطِ استواری شعار رہا، نام و نمود، جاہ و حشم کو خلافِ وضعِ درویشی سے ننگ و عار رہا۔ میں نے یہ ساری حکایت مغل جان کی زبانی سُنی ہے۔

بھلا بتاؤ تو سہی کہ واں بھی کسی ڈومنی کو مار رکھا ہے یا بے عشق و عاشقی جیتے ہو۔ ابتدائے شباب میں جو ایک مرشدِ کامل نے نصیحت کی تھی، وہ یاد رہی یا بھول گئے۔ بھائی ہم نے تو سُنا ہے کہ جنت میں گنجائشِ فسق و فجور نہیں۔ آدمی کتنا ہی سیر ہو جائے تو بھی اس یک رنگی سے نجات نہ پائے۔ سچ کہیو وہ جو دوزخ کو جنت میں ملانے کی تجویز تھی، رضوان کو پسند آئی یا نہیں؟ میں جو آپ کی اور اس کی لڑائی کا تصور کرتا ہوں تو کلیجہ مُنہ کو آتا ہے، طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ ہے ہے کیسے ستم دوست، کیسے وفا ناآشنا سے پالا پڑا ہے کہ فرار کی کوئی راہ نہیں "مدعیہ بجز صورت نباہ نہیں۔" ہائے کیا خوب کسی نے کہا ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے   مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

حضرت آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ دلّی اب آپ کے زمانے کی دلّی نہیں۔ قلعہ
چاندنی چوک، مجمع بازار مسجد جامع کا، سیر جمنا کی اور میلہ پھول والوں کا سب بحال
ہوئے، فرنگی راج اپنی نوبت پنج روزہ بجا گوشۂ گمنامی میں غرق ہوا۔ میرٹھ سے جو
کالوں کا ایک لشکر آپ کی زندگی میں دلّی آیا تھا اور اس نے گوروں کی بارک میں
شورش بپا کی تھی، وہ بار آور ہوئی۔ کئی قرن بیتے کہ انگریزی اقتدار ختم ہوا۔ وہ جو
کمپنی بہادر کے ہوا خواہ روسیاہ تھے، ایک ایک کرکے راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔
اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ ان کی دولت و ثروت، ہیبت و عظمت کا سکہ ہم
ہندوستانیوں کے دلوں پر نقش ہوکر رہ گیا تھا، پھر جو حریت کا بازار گرم ہوا، اور
جذبۂ حبِّ وطن نے ذہن میں انگڑائی لی، تو ایسی نفرت کی آندھی چلی کہ فرنگی راج دیکھتے
دیکھتے خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔ عمل دخل ان کور باطنوں کا ختم ہوا، زمام سلطنت
ہاتھ سے نکل گئی۔ البتہ ایک باب تاریخ کے اوراق میں اس عہد ظلمت کی یادگار
بن کے رہ گیا۔

جامع مسجد کے گرد و نواح ستّر گز میدان کا نکلنا، آہنی سڑک کا بننا، شہر میں فوجیوں
کے بارک تعمیر کیے جانا۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھنا، خاص بازار، اردو بازار،
خانم کے بازار، رام جی گنج، بیرم خاں کی بی بی کی حویلی کا معدوم کیا جانا تو آپ دیکھ گئے
تھے، اب دلّی کا دوبارہ تحس نحس کیے جانا بھی دیکھ جاؤ۔ نظام الدین ممنون
کہاں، ذوق کہاں، آزردہ و شیفتہ کہاں، غالب و مومن کہاں، کہ ان کے
دموں سے شہر آبادی کو پھر رونق نصیب ہو۔ البتہ ان کا تذکرہ گھر گھر ہوتا ہے۔
بڑی بڑی عالیشان یادگاریں اس شہر کے دلدادوں نے اپنے بزرگوں کے نام پر قائم

کی ہیں۔ سلطان جی ہیں ایک عمارت پختہ سنگ مرمر کی بنی آپ کے نام نامی کے ساتھ منسوب ہے۔ شاہ ولی اللہ کی خانقاہ کے پیچھے جو ایوان غالب ہے، وہ بھی کیا خوب ہے۔ عمر بھر ٹوٹی ہوئی چھت کے ٹپکنے اور احوال بارش کے برسنے کا دیکھا کیے۔ کہیں سلفچی کہیں لوٹا کہیں لگن رکھا۔ اب جو آپ نہیں ہیں اور آپ کے نام سے مکان تعمیر کیے جا رہے ہیں تو ان اگلی بے چینیوں کا خیال کر کے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ سچ کہا نظم و نثر کے جو دواعی خالق نے ازل سے آپ کو ودیعت کیے تھے، ان کی داد جیتے جی باندازۂ بایست ملی نہیں۔ آپ کہا اور آپ ہی سمجھا، مگر ہاں وہ جو پیشین گوئی اپنے بارے میں آپ نے کی تھی کہ میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں حرف بہ حرف صحیح نکلی، اب وہ کلام جس پر کبھی معاصرین ناک بھوں چڑھاتے تھے، مہمل گوئی کی پھبتیاں کستے تھے، مرجع خاص و عام ہے، اقبال کا ستارا برج عقرب سے نکل اس قدر بلند ہوا ہے کہ اس کی روشنی ایران و اصفہان اور سمرقند و بخارا تک پہنچی ہے۔ دستنبو کے وہ نسخے جو سانڈرس صاحب نے ملکۂ عالیہ والیٔ انگلستان کو بھیجے تھے، انھوں نے بنظر استحسان اور ادب پروری اپنے ذاتی کتب خانے میں رکھ لیے ہیں، اور ایک حکم جاری ہوا ہے کہ غالب نے اگر سکہ شعر کہا بھی تو ہم اسے معاف کرتے ہیں اور فتوح اس کی "تاحیات مستعار اس تک پہنچتی رہے گی۔ اگلی پچھلی کل ملاکر جو رقم واجب الادا ہے بلاتاخیر دیدی جائے" تاکہ کوٹھی سے شراب گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم اور صراف سے دام قرض منگانے کا سلسلہ بند ہو۔

ایک کروڑ روپیہ خاص ہندوستانی خزانے سے آپ کی برسی منانے پر

خرچ ہوا۔ کتابوں کا بیورا جو اس تقریب سعید میں اربابِ علم و دانش اور سخنوران ہند و پارس نے تصنیف کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ فنِ نکتہ شناسی کا حق ادا کر دیا۔ وہ جو ہندو مسلمان، عیسائی اور پارسی آپ کے دوستِ دلی اور جاں نثارانِ ازلی تھے انھوں نے ایک ایک مصرعہ کی داد دی۔ وہ وہ معنی پیدا کیے ہیں کہ عقل حیران اور آگہی انگشت بدنداں ہے۔ طباعت خوب ہے، کتابت مرغوب ہے، جدول سونے کے پانی کی روشن حروف کے گرد ایسی کھلی ہے کہ فلک بدیدۂ انجم نگراں ہے۔ ایک پارسل کتابوں کا آپ کے لیے باندھ رکھا ہے ذرا فرصت ہو تو نتھو کلیان کے ہاتھ ڈاک خانے بھیجوں۔ آج صفر کی چودھویں تاریخ اور دو شنبہ کا دن ہے۔ ہفتہ عشرے میں یہ تحفۂ نایاب آپ تک پہنچ جائے گا۔

کیوں صاحب، آپ تو کہتے تھے کہ فردوسی نے اپنے کلام کا کیا صلہ پایا۔ سعدی کو کیا ملا، عرفی اور خاقانی کے کیا ہاتھ آیا۔ اب جو یہ توقیر و تعظیم آپ کے کلام کی ہوئی ہے تو کیا یہ پذیرائی نہیں ہے۔ کیا ہوا اگر جیتے جی کلکتہ میں گرفتار رہے۔ تنگی ترشی سے گذر اوقات کی، گھر کے برتن بیچ بیچ کر کھائے، وہ بھی ایک جنم آپ کا تھا، اور اب جو یہ جنم آپ نے لیا ہے تو حاسدوں کا کلیجہ شق ہے۔ مانندِ ریسمانِ آتش دیدہ بل کھاتے ہیں۔ اربابِ فرنگ نسخہ ہائے دیوان بطور ارمغان لے جاتے ہیں۔ مجھ میں اور آپ میں کہ خلت و صفوتِ باہمی اور رشتۂ باطنی ہے، یہ قدر افزائی اور عزت افزائی آپ کی دیکھتا ہوں تو خوش ہوتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ آپ بھی اس عالمِ آب و گل میں ہوتے تو سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے!

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

شہر آبادی کی کہانی

دلّی والوں کی زبانی

بہادر شاہ ظفر تخت پر جلوہ افروز ہوئے تو ان کی عمر تریسٹھ سال اور دس مہینے کی ہو چکی تھی۔ برائے نام بادشاہت رہ گئی تھی۔ کیونکہ ایک چھوٹی سی ہندوستانی ریاست کے برابر بھی بادشاہ دلی کو وسعت و قدرت و استطاعت نہ رہی تھی بقول سودا "ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خداوند تھا اس کے تصرف میں فوجداری کول۔ فقط ایک لاکھ روپیہ ماہوار سرکار انگریزی سے آتا تھا اور کسی قدر پرگنات و محالات و تہہ بازاری و کرایہ دکانیں و آمدنی باغات و نزول خالصہ وغیرہ۔ من کل الوجوہ سوا لاکھ روپیہ ماہوار تصور کر لینا چاہیے۔ مگر عظمت جلال و شان و شوکت و احتشام و ادب و آداب دربار اور انتظام جلوس و سواری کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ہاں کسی زمانے میں یہ خاندان عالیشان سزاوار فرمان روائی ہندوستان

جنت نشان ہوگا۔ مگر باوجود انحطاط و کسر تمول و قلت معاش واقعات حیرت انگیز و تعجب خیز ایسے نظرے گذرے ہیں کہ دیکھنے والے کو ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ خدائے عالم نے اس لاکھ روپے میں ایسی برکت عطا فرمائی تھی کہ وہ خیر و برکت کروڑوں روپے کی آمدنی والی ریاستوں میں نہ دیکھی۔ چار روپے کا سپاہی ہے وہ بھی خوش حال اور بیش قرار دو یا ہے والا ہے وہ بھی مالا مال ہے۔ گردشِ روزگار کا کسی کو شاکی نہ پایا۔ یہ ثمرہ خوش نیتی اور نیک بختی کا ہے۔ قرائن سلطانی و سطوتِ جہانبانی جو دربارِ شاہی میں دیکھے وہ کسی ریاست میں نہ پائے۔ خرچہ اخراجات شاہی پر جو نظر ڈالی جاتی ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے کہ یا الٰہی یہ کیا معاملہ تھا اتنی برکت خزینۂ شاہی میں کہاں سے آگئی تھی کہ ان اخراجات اور دریا دلی کی مکتفی ہوتی تھی۔

ایک بیگم کے محل میں صبح ہی ایک سنار کا لڑکا جس کی عمر تیرہ، چودہ برس سے زیادہ نہ تھی چھوٹی سی ہتھالی، سنسی اور ہتھوڑی اور اسی قسم کے چند اوزار لے کر آجاتا تھا۔ بیگم اپنا صندوقچہ کھولتیں اور اس میں سے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی سیر بھر سونے کا جڑاؤ گہنا اس سنار کے لڑکے کے حوالے کر کے کہتیں "بیٹا نگینے سونے سے اس طرح الگ کرنا کہ کوئی نگینہ گرے نہیں، موتی کو ریخ نہ جائے، نہیں یاد رکھنا تیرے کان اینٹھوں گی۔" سنار کا لونڈا ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا کسی نگینہ پر کھر بچ نہ آئیگی۔ پھر وہ اپنے ٹھیئے پر بیٹھ جاتا اور نگینے گہنے سے الگ کرتا رہتا تھا، یہاں تک کہ بارہ بجے کی توپ چل جاتی۔ وہ سب نگینے الگ کر لیتا اور ایک طشتری میں رکھ کر وہ نگینے اور دوسری رکابی میں رکھ کر سونے کا بگڑا ہوا زیور بیگم کے سامنے لاتا تھا۔ بیگم

لاپرواہی سے کہتیں "گل چہرہ یہ نگینے جواہر خانے کے داروغہ کو سونپ دے"،
اور سونے کے زیور کی نسبت کہتیں "سُنار والے، یہ لے جا تیری محنت کا حق ہے کل
صبح پھر آجانا" یہ لال قلعہ کے گذرے وقت کا حال ہے، جب نادر شاہ سب کچھ
لُوٹ کر لے گیا تھا۔ پھر احمد شاہ نے تاراج کیا تھا۔ پھر بھرت پور والے نے لُوٹ
مچائی تھی۔ پھر میاں غلام قادر نے ستم ڈھائے تھے اس پر یہ حال تھا کہ لال
قلعہ کی بیگموں اور شہزادیوں کی نظر میں سونا تو سونا ہیرے جواہرات تک بے
حقیقت تھے۔

جہاں پناہ کے چڑیا خانے میں ایک بلبل ہزار داستان پلی ہوئی تھی۔ سونے کے
پنجرے میں رہتی تھی۔ اُستاد میرن جو چڑیا خانہ اور کبوتر خانہ کے داروغہ تھے اس کی
رکھوالی کرتے تھے۔ اس کے پنجرے پر کئی بسنتیاں سنڈھی رہتی تھیں۔ جب بہار کا
موسم آجاتا تو بلبل کو چہکنے کا شوق ہوتا۔ استاد میرن اس کا پنجرہ لے کر بیگم کے
باغ میں آتے تھے اور رکھٹے کے درخت کی ٹہنی میں اسے لٹکا دیتے تھے۔ شہر میں ایک روز
پہلے سے دھوم مچ جاتی کہ کل مغرب کے وقت استاد میرن بادشاہی بلبل کا پنجرہ
لے کر بیگم کے باغ میں آئیں گے۔ شوقین لوگ اپنی اپنی اگن، چنڈول، طوطے، مینا،
شاما وغیرہ بولنے والے جانوروں کے پنجرے لے کر باغ میں پہنچتے۔ گھاس کے تختوں
پر جو مخمل کو مات کرتی تھی پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتے تھے اور اپنے اپنے پرندوں کے
پنجرے اپنے آگے رکھ لیتے تھے۔ بادشاہی بلبل ہزار بولیاں بولتی جنھیں سُن کر سُننے
والے سبحان اللہ کہتے۔ بلبل کے دم کو سُن کر پرند شوقین کا یہ چہکنے لگتا تو اس کا
مالک پنجرے کو تھپک دیتا۔ جس سے یہ مُراد تھی کہ بلبل ہزار داستاں کی بولی کان لگا کر

سُن اور چپ رہ تاکہ تجھے بھی یہ ہانک آجائے اور فی الواقع بلبل کی بولیاں سُن سُن کر شاہجہاں آباد کے شوقین لوگوں کے اگن، چنڈول خوب بولنے لگے تھے۔ لوگ فخریہ کہتے تھے کہ جناب ہمارے اگن، چنڈول نے بادشاہی ہزار داستان کی مار کھائی ہے۔ کبھی کبھی بلبل کا پنجرہ رات کے وقت محل میں بھی آجاتا تھا اور جہاں پناہ کے چھپر کھٹ کے پاس لٹکا دیا جاتا تھا۔ جب تک حضور کا جی چاہتا اس کا چہکنا سُنتے تھے جب جی بھر جاتا پنجرہ باہر بھجوا دیا جاتا تھا۔

دیوانِ خاص کے وسط میں تختِ طاؤس نصب ہوتا تھا اور بالائے تخت نگیرہ زریں، جو بپائے نقرہ ملمع طلائی پر نصب ہوتا تھا تختِ طاؤس کے برابر چار گوشوں پر چار طاؤس طلائی مینا کار نصب ہوتے تھے اور ان کی منقاروں میں بڑے موتیوں کی مالائیں جن میں زمرد کے گچھے تھے، آویزاں ہوتی تھیں ——— تختِ طاؤس میں مسند تکیے لگائے جاتے تھے۔ جب بادشاہ دربار فرماتے تختِ طاؤس کے دونوں پہلوؤں میں دو طرفہ دو صفیں درباریوں کی دست بستہ ایستادہ ہوتی تھیں۔ سب نیچی نگاہیں کیے کھڑے رہتے تھے۔ خاموش۔ مجال کیا ہے کہ کوئی کسی۔۔ کی طرف دیکھ لے یا کھجائے یا مسکرا لے یا بات کہے۔ دربار کے دونوں گوشوں پر دو قطار لکڑی بردار، دو لکڑیاں سرخ لیے کھڑے رہتے تھے۔ ذرا سی کسی سے بے اعتدالی ہوئی اور گردن میں لکڑی ڈال کر دربار سے باہر کیا گیا۔ اور روسائے ہند کا سا دربار نہ تھا۔ دیوان خاص کے مقابل لال پردے کا دروازہ تھا۔ وہاں سرخ بانات کا پردہ کھچا رہتا تھا۔ جو شخص دروازہ

میں سے داخلِ دیوانِ خاص ہوتا تھا، پہلے لال پردے کے آگے آکر سلام گہہ پر استادہ ہوتا تھا آداب تسلیمات بجالاتا تھا اور تین سلام مؤدب بہت جھک کر بجالاتا تھا اور نقیب لال پردے کے برابر سے آواز لگاتا تھا "ملاحظہ آداب ہے۔ آداب بجالاؤ۔ جہاں پناہ بادشاہ سلامت، عالم پناہ بادشاہ سلامت۔" بعد اس کے یہ شخص سلامی پہلو میں ہوکر عقب حمام کی جانب کے زینہ سے دیوانِ خاص کے چبوترہ پر چڑھتا اور نعلین خالی کرتا اور دیوانِ خاص میں جاکر دوبارہ دوسری سلام گاہ پر آداب بجالاتا اور نقیب دربار بطور اوّل آواز لگاتا اور سلام کراتا۔ اگر نذر گذارنی ہے تو سیدھا تخت کی جانب جاکر نذر پیش کرے گا اور بادشاہ نذر اُٹھاکر نذر نثار کے داروغہ کو دے دیتے تھے۔ نذر نثار کا داروغہ تخت کے پہلو میں استادہ رہتا تھا اور ایک متصدی لکھتا جاتا تھا مگر نذر دے کر پھر پچھلے قدموں ہٹ کر سلام گاہ تک جاتا اور بقاعدہ اوّل پھر اُسی طرح آداب بجالاتا اور جہاں جا ملتی، صفِ دربار میں جا ملتا تھا۔ تخت کے عقب میں خواص لوگ عہدہ کے کھڑے رہتے تھے۔ وہ یال ہما سے مگس رانی کرتے تھے۔ اگر کچھ عرض معروض کرنی ہے تو عرض بیگی درمیان دونوں صفوں کے کھڑے رہتے تھے۔ عرضی ان کو دیدی جاتی تھی اور وہ عرضی لے جاتے تھے۔ بادشاہ کے سامنے عرضی کو کھول کر ملاحظہ کرادیتے تھے۔ پشت عرضی، عرض بیگی کی جانب ہوتی تھی۔ بعد ملاحظہ عرضی خواہی اُسے پیش کرتا تھا اور وہ بصورت آئینہ گھر کے مجوف تھا۔ اُس میں قلم سرکے رکھے رہتے تھے۔ عرضی کو اُس پر رکھا گیا۔ دربادشاہ نے دستخط فرمادیے جس حکم کے نام حکم ہوا، فوراً تعمیل ہوگئی۔"

شہزادوں کی شادیوں کے موقع پر جشن منعقد ہوتے تھے اور تقریبات ہوتی تھیں۔ تزک جہانگیری میں جہانگیر بادشاہ نے اپنے بیٹے خرم (شاہجہاں) کی شادی کی تقریبات اور جشن کا ذکر کیا ہے۔ اسے پڑھتے جائیے اور لطف اٹھاتے جائیے۔ لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب آتش جوان تھا۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ تیموریہ خاندان کا جب چراغ ٹمٹما رہا تھا، اس وقت بھی شادی کی تقریبات ویسی ہی تھیں جیسی کہ ہم نے شاہزادہ خرم کی شادی میں پڑھا ہے:-

"ہر چند کہ تقریبات بسیار ریاستہائے ہندوستان میں نظر سے گذری ہیں۔ مگر جیسی شادی بازیب و تجمل شاہزادہ مرزا جواں بخت کی ہوئی، ایسی رنگین محفل و تقریب دلفریب یا جاہ و حشم اس دریا دلی کے ساتھ کہیں نظر سے نہیں گذری۔ بیان تکلفات رسوم۔ ساچق و مہندی و برات و آرائش شہر و روشنی و نقار خانہ جات وغیرہ فضول جان کر قلم انداز کیا جاتا ہے۔ البتہ دو امر قابلِ نگارش ہیں۔ ایک یہ کہ قرینہ محفل سب سے جدا گانہ تھا۔ دیوان کی بارہ دری میں جدا جدا محفلیں ترتیب دی گئیں تھیں۔ ہر در میں ایک طائفہ جدا رقص کرتا تھا۔ شاہزادگان کی محفل جدا، ملازمین معززین کی انجمن جدا، فرقہ سپاہ کی بزم جدا۔ شاگرد پیشہ کے لیے بھی جدا۔ اسی طرح ہر فریق کی محفل جدا تھی۔ اہلِ شہر کے لیے حکم عام تھا کہ آئیں اور تماشائے رقص و سرود سے محظوظ ہوں۔ رقاصان پری پیکر ہر طرف گرم ناز و انداز تھیں و مہ جبینان ناہید نواز زمزمہ پرداز۔ دس بارہ روز تک یہ محفلیں گرم رہیں۔ کل ملازمین شاہی و روسائے شہر کے واسطے تورہ جات کا حکم تھا جس کا جی چاہے زرِ نقد پچاس

روپے توڑے کی قیمت لے۔ خواہ توڑہ لے۔ جتنے قلم کے نوکر تھے نام بنام سب کو توڑے۔ اس دریا دلی سے توڑہ تقسیم ہوتا تھا کہ جس روز توڑہ آتا تھا تمام عزیز و اقارب، دوست احباب کے گھر کھانا تقسیم ہوا کرتا تھا۔ ایک توڑہ میں طعام اس قدر ہوتا تھا کہ ایک محفل شکم سیر ہو کر کھائے۔ ایک ایک طباق میں پانچ پانچ سیر کھانا ہوتا تھا۔ چار چار، پانچ پانچ طرح کے پلاؤ، رنگ برنگ کے میٹھے چاول۔ سرخ۔ سبز۔ زرد۔ اودے۔ پانچ سیر کی باقرخانی، ایک شیریں، ایک نمکین اور کئی قسم کے نان، غرض کہ اقسام خوردنی سے کوئی شے باقی نہ رکھی گئی تھی۔ مختصر یہ کہ کسی ریاست میں ایسی پُر تکلف کوئی تقریب نظر سے نہیں گذری جو اس گئی گذری سلطنت میں دیکھنے میں آئی۔ اس کے علاوہ جن شعراء نے قصائد، تہنیت اور سہرے لکھے تھے باوجودیکہ ملازم تھے، مگر سب کو صلے و خلعت و انعام عطا ہوئے، اور شاگردپیشہ کو جوڑے تقسیم کئے گئے"۔

•

"بادشاہ کی سواری میں سولہ گھوڑے لگائے جاتے تھے اور نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی سواری میں آٹھ گھوڑے لگائے جاتے تھے"۔

۵ "سواری تیار ہے۔ بادشاہ برآمد ہوئے۔ جسولنی نے آواز دی خبردار ہو۔ نقیب چوبداروں نے جواب دیا۔ اللہ و رسول خبردار ہے۔ سب نے مجرا کیا۔ چوبدار پکارا۔ "کرو مجرا جہاں پناہ، بادشاہ سلامت"۔ کہار ہوادار لائیے؟"

بادشاہ سوار ہوئے۔ چتر بردار نے بانات زرِانداز میں چتر لپیٹ بغل میں مارے۔ دو خواص تختِ رواں کے دونوں طرف مورچھل لے کر ساتھ ہوئے۔

اور خواص گشتی دستنقچہ۔ رومال۔ بیٹی پاک۔ اگالدان اور ضرورت کی چیزیں لیکر
چلے۔ بھنڈے بردار۔ بھنڈا لے تخت رواں کے برابر آ گیا۔ بھنڈے کا پیچ بادشاہ
نے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک ٹوکرے میں آب حیات کی صراحیاں برف میں لگی ہوئی
ایک طرف آگ کی انگیٹھی۔ کوئلوں کے گل۔ بھلیہ۔ تمباکو۔ کہار بہنگی میں لیے ساتھ ساتھ
ہے۔ گھڑیالی ریت کی گھڑی۔ گھڑیال ہاتھ میں لٹکائے گھڑی بھر بجاتا ہے۔ امیر امراء
تخت کا پایا پکڑ کر اپنے رتبے سے چلے جاتے ہیں۔ کہار پنکھا آفتابی لئے۔ جبشی قلار چاندی
کے شیر دہان سونٹے۔ لال لال آنکڑے دار لکڑیاں ہاتھوں میں لئے گرد و پیش
تخت رواں کے چلے جاتے ہیں۔ نقیب۔ چوبدار۔ سونے کے عصا ہاتھوں میں لیے
آگے آگے پکارتے جاتے ہیں "بڑھے جاؤ صاحب! بڑھاؤ قدم کو" جا بجا ہے
جہاں پناہ بادشاہ سلامت، خاص بردار ڈھلیٹیوں کو دیکھو! لال لال بانات
کے انگرکھے پہنے۔ کالی پگڑیاں۔ دوپٹے سر سے باندھے لال بانات کے غلاف
بندوقوں پر چڑھے ہوئے کندھوں پہ دھرے ڈھلیٹے پیٹھ پر ڈھال کمر میں
تلوار لگائے۔ ان کے آگے کڑکیٹ گڑ کا کہتے۔ ان کے آگے خاصے گھوڑے چاندی
سونے کے ساز لگے۔ رومی مخمل کے غاشیے کارچوبی کام کے پڑے۔ سر پر کلغیاں
چھم چھم کرتے چلے جاتے ہیں۔ سئیے پھڑکا و کرتے جاتے ہیں۔ دیکھو گھوڑا باگ سے
ہرتا پھرتا ہے۔ کہار گھٹنے کے اشارے سے کام دیتے ہیں جس طرح گھٹنے کا اشارہ
بادشاہ کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہرتے پھرتے ٹھیرتے چلتے ہیں۔ لیجئے! سورج کرن
نکلی۔ کہار نے آفتابی لگا دی۔ سواری پھر آئی۔ دیوان خاص میں بیٹھ کر خلقت
کا دربار کیا۔

بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں تہواروں کی رونقیں اُسی طرح رہیں۔ محرم۔ عید الفطر۔ ہولی۔ اور دیوالی سبھی تہواروں میں بادشاہ خود بھی شامل ہوتے تھے اور لوگوں کو ایسے موقعوں پر عطیات تقسیم کرتے تھے۔

محرّم کا چاند دکھائی دیا۔ ماتم کے باجے بجنے لگے۔ سبیلیں رکھی گئیں۔ بادشاہ حضرت امام حسنؑ حسینؑ کے فقیر بنے۔ سبز کپڑے پہنے گلے میں سبز کفنی۔ جھولی ڈالی۔ جھولی میں الائچی دانے۔ سونف۔ خشخاش۔ مصری۔ درگاہ میں جاکر سلام کیا۔ نیاز دی۔ دس دن تک صبح کو کھانا، شام کو شربت فقیروں کو بٹے گا۔ چھٹی تاریخ ہوئی آج بادشاہ لنگر میں چکھیں گے۔

"لیجیے عید آئی۔ راتب توپیں، ڈیرے، خیمے، فرش فروش۔ عیدگاہ روانہ ہوا۔ سواری کا حکم ہوا۔ ہاتھی رنگے گئے۔ صبح کو بادشاہ نے حمام کیا۔ پوشاک بدلی، جواہر لگایا۔ خاصے والیوں نے جلدی سے دسترخوان بچھایا۔ سویاں، دودھ، اُبلے بتاشے۔ چھوارے۔ پستہ اور کھڑی مسور کی دال اس پہ لگادی۔ بادشاہ نے نیاز دی۔ مزہ اس پر چکھ کے کلی کی۔ باہر برآمد ہوئے۔ چوبداروں نے خبرداری بولی۔ باہر نوبت ہوئی۔ سب جلوس قاعدے سے کھڑا ہو گیا۔ نوجدار خاں مہاوت نے ہاتھی بٹھادیا۔ کہاروں نے ہوادار تخت رواں کے برابر لگادیا۔ بادشاہ ہودے میں سوار ہوئے۔ دیوان عام میں سواری آئی۔ اختتام توپ خانے کی توپوں کی اکیس آوازیں ہوئیں۔

قلعہ کے دروازوں پر پلٹنوں نے سلامی اُتاری۔ اکیس توپیں چلیں۔ عیدگاہ کے دروازے پر سواری پہنچی جلوس دو طرفہ کھڑا ہو گیا۔ سلامی اُتاری توپیں سلامی کی چلنے لگیں۔ دروازے پر سے بادشاہ ہوادار میں اور ولی عہد پالکی میں اور سب پیدل عیدگاہ کے اندر آئے۔ چبوترے پر سے اُتر کر خیمے میں اپنے مصلّوں پر کھڑے ہوئے۔"

دیوالی کے موقع پر بادشاہ خود اس میں حصہ لیتا تھا اور انعام و اکرام تقسیم کرتا تھا۔ لو آج بہلادیا ہے۔ روشنی ہوئی۔ نوبت۔ روشن چوکی اور باجہ بجنے لگا۔ چاروں کونوں میں ایک ایک گنا کھڑا کیا۔ نیبوؤں میں ڈورے ڈال کر اُن میں لٹکا دیے۔ صبح کو وہ گنے اور نیبو حلال خوری کو دے دیئے۔ رنگا رنگ بیلوں کو سنوار بنا کر۔ پاؤں میں مہندی رنگ برنگ کی اُس پر نقاشی کر سینگوں پر قلعی اور سنگوٹیاں ہاتھوں پر کارچوبی پٹے اور سنگھ۔ گلوں میں گھنگھرو۔ اوپر کارچوبی بانات جھولیں پڑی ہوئی چھم چھم کرتے چلے آتے ہیں۔" بیلوں کو دکھا انعام و اکرام لے اپنے کارخانوں میں آئے۔ دیوالی ہو چکی۔

بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں ہولی کا تہوار بھی بڑے زور شور سے منایا جاتا تھا۔ چاروں طرف ایک زبردست چہل پہل ہوتی تھی۔ شہر بھر میں جتنے سوانگ رچنے جاتے تھے وہ سب بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوتے تھے اور انعام اکرام لے کر رخصت ہوتے تھے۔

”دیکھو! ہولی میں جتنے سوانگ شہر میں بنے۔ سب بادشاہ کے جھروکوں کے نیچے آئے۔ انعام لے کر رخصت ہوئے۔“

تیموریہ خاندان کی تاریخ گواہ ہے کہ بادشاہوں کو عوام سے گہری محبت تھی اور وہ ان کے لیے مرمٹنے کو تیار رہے۔

ایک بار گھوسیوں کو سرکار انگریزی نے حکم فرمایا کہ تم لوگ اپنی گائیں بھینس لے کر شہر سے نکلو اور بیرون شہر پناہ جاکر آباد ہو۔ تمام شہر میں ایک غلغلہ برپا ہو گیا۔ تمام گھوسی اپنے بال بچوں اور مویشی کو لے کر ریتی میں آپڑے۔ اب یہ حال ہوا۔ ادھر تو مویشی حیران پریشان گھبرائے ہوئے، ادھر فریادیوں کے بال بچوں کی گریہ و زاری کی پکار۔ یہ حال دیکھتے ہی بادشاہ رعیت پناہ کو کہاں تاب تھی کہ یہ زیادتی دیکھ سکیں۔ انھوں نے حکم دیا کہ ہمارا خیمہ بھی ریتی میں لبِ دریائے جمن ان کے برابر لگا دو۔ جو حال رعیت کا وہ ہمارا۔ شاگرد پیشگان نے بمجرد اصدار حکم بارگاہ سلطانی لے جاکر لبِ دریا استادہ کر دیئے۔ یہ خبر صاحب ریذیڈنٹ بہادر کو ہوئی۔ وہ خبر سنتے ہی بادشاہ کی خدمت میں دوڑے ہوئے آئے اور حضور سے درخواست کی کہ حضور یہ کیا کرتے ہیں؟ حضور (بہادر شاہ ظفر) کے ہمراہ ساری رعیت شہر سے نکل کھڑی ہو گی۔“

بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں مولا بخش ہاتھی تھا۔ اُس نے کئی بادشاہوں کی سواریاں دی تھی اور بزمِ آخر کا تماشہ دیکھنے کے لئے ابھی تک زندہ تھا۔

اس ہاتھی میں بہت ساری باتیں انسانوں جیسی تھیں۔ جب بادشاہِ وقت بہادر شاہ ظفر کو اس کی سواری درکار ہوتی تھی تو وہ ایک حکم نامہ لکھ کر بھیجتے تھے ۔ شاہی چوبدار بادشاہ کا یہ حکم لیکر اس کے پاس جاتا تھا اور حکم شاہی سناتا تھا وہ کھڑا ہوتا تھا اور سلامی دیتا تھا۔ سواری سے ایک دن پہلے وہ دریا پر جاکر خوب نہاتا اور اپنے آپ کو صاف کرتا۔ پھر بادشاہ کی سواری میں جاتا۔ یہ تو اس وقت کی کہانی تھی جب شمع خموش نہیں ہوئی تھی۔ اور اب اُس وقت کی کہانی سنئے جب "اک شمع رہ گئی تھی" سو وہ بھی خموش ہے۔ مولا بخش نے مارے غم کے کھانا پینا چھوڑ دیا اور اداس و غمگین رہنے لگا۔

دو جب فیل خانہ شاہی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو مولا بخش ہاتھی نے دانہ پانی چھوڑ دیا۔ فیلبان نے آگے سانڈرس کو خبر دی کہ کل کلاں کو یہ کہیں بد ہو جائیگی تو سرکار مجھے پھانسی دیگی سانڈرس صاحب کو باور نہ آیا۔ فیل بان کو گالیاں دیں اور کہا کہ ہم چل کر خود کھلائیں گے اور پانچ روپے کے لڈو اور کچوریاں ہمراہ لے کر ہاتھی کے تھان پر پہنچے۔ اور ٹوکرہ شیرینی کا ہاتھی کے آگے رکھوایا۔ ہاتھی نے جھلا کر ٹوکرا کھینچ مارا۔ اگر کسی کے جا کر لگتا تو تمام ہو جاتا۔ وہ ٹوکرا دور جا کر گرا اور تمام شیرینی بکھر گئی۔ سانڈرس بولے ہاتھی باغی ہے اسے نیلام کر دو۔ اسی روز صدر بازار میں لاکر استادہ کیا اور نیلام کی بولی بولی۔ کوئی خریدار نہ ہوا۔ منسی بنساری یک چشم جس کی دوکان کھاری باولی میں تھی، اُس نے ڈھائی سو روپے کی بولی دی۔ اسی بولی پر صاحب نے نیلام کر دیا۔ فیل بان نے ہاتھی سے کہا کہ لے بھائی! تمام عمر تو نے اور میں نے بادشاہوں کی نوکری کی اور اب میری اور تیری تقدیر پھوٹ گئی۔

ہلدی کی گرہ بیچنے والے کے دروازے پر چلنا پڑا۔ یہ سنتے ہی ہاتھی کھڑے قدم دھم دلیسی وہیں زمین پر گر پڑا اور جان بحق ہو گیا۔"[۵]

حوالہ جات

۱۔ طراز ظہیری۔ ظہیر

۲۔ بزم آخر۔ فیاض

۳۔ لال قلعہ کی ایک جھلک۔ فراق

۴۔ مقام محمود۔ عبدالمالک

دِلّی کی بِپتا

بندرے نے کہا صاحبو! دنیائے دوں، نیرنگیِ زمانہ سفلہ پرور، بوقلمونِ عبرت و دید کی جا ہے۔ گرما گرم آیند و روند کا بازار ہے، کس و ناکس جنسِ ناپائیدار ہے، لہو و لعب کا خریدار ہے، اپنے کام میں مصروف قضا ہے، جو شے ہے فنا ہے۔ معاملاتِ قضا و قدر سے ہر ایک ناچار ہے، یہی مسئلہ جبر و اختیار ہے۔ دنیا جائے آزمائش ہے، نادان جانتے ہیں یہ مقام قابلِ آرام و آسائش ہے۔ دو روزہ زیست کی خاطر کیا کیا ساز و سامان پیدا کرتے ہیں، فرعونِ بے سامان ہو کر زمین پر پاؤں نہیں دھرتے ہیں۔ انجام شاہ و گدا دو گز کفن اور تختۂ تابوت کے سوا نہیں۔ کسی نے اودھی یا محمودی کا دیا۔ کسی کو گاڑھا گزی کا میسّر ہوا۔ کسی نے بعدِ مرگ سنگِ مرمر کا مقبرہ بنایا، کسی نے مر مر کے گور گڑھا پایا۔ کسی کا مزار مطلّا، منقّش، نہ گار رنگ ہے، کسی کی مانند سینۂ جاہل گور تنگ ہے۔ حسرتِ دنیا ہے کفن چاک ہوا بسترِ دونوں کا

فرشِ خاک ہوا۔ نہ امیر سمور و قاقم کا فرش بچھا سکا، نہ فقیر پھٹی شطرنجی اور ٹوٹا بوریا لاسکا۔ بعد چندے جب گردشِ چرخ نے گنبد گرایا، اینٹ سے اینٹ کو بجایا تو ایک نے نہ بتایا کہ دونوں میں یہ گورِ شاہ ہے یہ لحدِ فقیر ہے۔ اس کو مرگِ جوانی نصیب ہوئی، یہ استخوانِ بوسیدۂ پیر ہے، دنیا فقط رہگذر ہے، ہر دم مثالِ تارِ نفس در پیشِ سفر ہے۔ تا زیست ہزاروں مفسدے ہیں، ڈر ہے، مرنے کے بعد بازپرس کا خطر ہے۔ کسی طرح انسان کو مفر نہیں، کون سا نفع ہے جس کی تلاش میں ضرر نہیں۔ حاصلِ کار یہ ہے کہ دنیا میں جینے کی خوشی نہ مرنے کا غم کرے، تا مقدور کسی کی خاطر نہ برہم کرے، دل شکستہ کی دلداری، یا افتادہ کی مددگاری کرے، ایک دن مرنا ہے، جینا مستعار ہے، اس پر کس کا اختیار ہے۔ نیک عمل کا خیال رہے کہ قیدِ ہستی زیست کا نام ہے، رہائی یہاں سے انجام ہے۔ جب وعدہ آپہونچا تو نہ روپیہ کام آتا ہے، نہ فوجِ ظفر موج سے کچھ ہو، نہ تہمتن بچار بچا تا ہے۔ اگر یہی مانعِ قضا و قدر ہوتے، جمشید و کاؤس، دارا و سکندر بصد حسرت و افسوس جان نہ کھوتے ؎

کچھ کام نہ آوے گا تیرے یہ لعل و زمرد سیم و زر
جب پونجی باٹ میں بکھرے گی ہر آن بنے گی جان اوپر
نقارے، نوبت، بان، نشان، دولت، حشمت، فوجیں، لشکر
کیا مسند تکیہ ملک مکان کیا چوکی کرسی تخت چھپر
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلیگا بنجارا

یا فقیر! یہ خاکسار ہیچ مقدار رہنے والا اس اجڑے دیار کا ہے جسے اہلِ علم و اربابِ دانش ہندوستان کا دل، جہاں آباد کہہ کے پکارتے ہیں۔ جنت مکان، صاحبقران، شاہ جہاں بادشاہ نے اپنے جلوس تخت نشینی کے بعد جب آگرے

کی گلیوں کو فیلانِ گراں ڈیل کے لیے تنگ پایا تو احکامات صادر فرمائے کہ آگرے کے تاجر اور رئیس جو مالکان حویلی اور کوٹھوں کے ہیں، اگر بہ رضا و رغبت شہر سے دُور کہیں اور بسنا قبول کریں تو اس شہر کے بازار کشادہ کرنے کے لیے کچھ مکانات منہدم کر دیئے جائیں گے۔ شہر کے رؤسا کو یہ تجویز پسند نہ آئی اور بمجرد سننے اس حکم کے بادشاہ غریب پرور کے دربار میں حاضر ہو کر دست بستہ عرض کی کہ ارشاد حضور کے سر، ہر چند ہمارے تئیں سرتابی کی مجال نہیں۔ رعیت آپ کی ہیں، جانِ عزیز درکار ہو تو قدموں پہ نثار کریں مگر عدل گستری اور انصاف پروری عالی جاہ کی پہ نظر کر کے یہ عرض کرنے کی جسارت کی ہے کہ ملک آپ کا از مشرق تا مغرب چار دانگ پھیلا ہوا ہے جنگل بیابان اور افتادہ زمینوں کی کمی نہیں اگر ہزار قریہ اور شہر پلک جھپکتے آباد کرنے کا قصد کریں تو عنایت ایزدی سے چنداں دشوار نہیں۔ ہم کہ اپنے باپ دادا کے وقتوں سے یہاں بود و باش رکھتے ہیں اور مٹی اس دیار کی ہمارے لیے کحل الجواہر سے زیادہ ہے۔ آدمی جہاں رہتا ہے اس سرزمین سے اسے لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ فطرت انسان کی ہے، لہٰذا اگر جان کی امان ہو تو مدعا یہ ہے کہ ہماری جمعیت ہرگز اپنی رضامندی سے گھر بار چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے، یوں سرکار کو اختیار ہے، ہم آپ کی رعیت اور بندۂ بے دام ہیں جہاں آپ بھیجیں گے چلے جائیں گے، عذر کی مجال نہیں، حکم عدولی کا خیال نہیں۔ تب بادشاہ نے تامل کیا اور شفقت سے فرمایا، خاطر جمع رکھو، ہراساں نہ ہوجیو، تمہاری حویلیاں اور تمہارے گھر جیوں کے تیوں قائم رہیں گے۔ دل آزاری ہمارے تئیں شعار نہیں ہے۔ جو تمہاری خوشی یہی ہے تو ہم یہاں سے دُور جمنا کنارے دوسرا شہر بسائیں گے اور اربابِ حل و عقد کو اپنے ہمراہ یہاں سے لے جائیں گے۔

اس وقت شاہجہاں آباد کی بنیاد پڑی اور ایک قطعہ زمین کا جو دریا کے کنارے بیابان پڑا تھا اس کے نصیبوں نے یاوری کی۔ سب سے پہلے لال حویلی کی بنیاد پڑی۔ جہاں پناہ بہ نفس نفیس آگرہ سے چل کر دہلی تشریف لائے۔ لال قلعے سے کچھ دور عارضی مکان رہائش کے لیے تعمیر کرایا اور اس میں قیام پذیر ہے۔ یہ مکان عالیشان دست بردِ زمانہ کے ہاتھوں کھنڈر ہو گئے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے تک کلاں محل کے نام سے استادہ تھا۔ غریب غربا و اہلِ حرفہ اور پیشہ وروں نے اس میں سکونت اختیار کی تھی۔ یکبارگی احکامات حاکم وقت کی عدالت سے جو صادر ہوئے تو اسے نابود کر دیا گیا۔ نشان اس کی بنیادوں تک کے نہ رہے البتہ ایک وسیع اور کشادہ میدان اس کی جگہ دکھائی دیتا ہے۔

جب لال قلعہ کی نیو رکھی جا رہی تھی تو بڑے بڑے لوہے کے کڑھاؤ اور تانبے کے ناندوں میں چربی کھولائی جاتی تھی اور پھلکیوں کی طرح اس میں کوری اینٹیں ڈالی جاتی تھیں۔ جب اینٹیں خوب چربی پی لیتیں تو نکال کر ٹھنڈی کی جاتی تھیں، اور گچ کے ساتھ بنیادیں رکھی جاتی تھیں۔ گچ میں سفیدی نارنول کے پتھر کی، ماش کا آٹا، مردار سنگ، گڑ، السی کا تیل ڈال کر بیل گری کا پانی چھان کر دیا جاتا تھا۔ یہ ادنیٰ قسم کا مسالہ تھا اور بڑھیا مسالوں کی تفصیل کے لیے دفتر درکار ہیں۔ لال قلعے کے اندرونی مکان، قصر، ایوان بن رہے تھے، تخت طاؤس کے لئے جواہر تراشے جاتے تھے، جنگل میں منگل تھا۔ ہزاروں معمار، مزدور، کاریگر خیموں میں، چھولداریوں میں، جھونپڑیوں میں پڑے رہتے تھے۔ دور، دور کی پہاڑیوں سے چھکڑوں میں پتھر لدے چلے آتے تھے۔ ایک چھکڑے میں سو سو پچاس پچاس بیل جوتے جاتے تھے۔ سنگتراشوں کی چھینیوں اور

ٹانگیوں کی دھڑا دھڑ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر سو قدم کے فاصلے پر ایک خیمہ خزانے کا برپا تھا۔ ایک ہندو خزانچی، تین محرّر اور دس سپاہی روپے کی حفاظت کے لئے حاضر رہتے تھے۔ روپے، اٹھنیاں، چونیاں، دوانیاں، پیسے اور کوڑیاں رکھی رہتی تھیں۔ کام اماں میں زیادہ اور ٹھیکے میں کم ہوا کرتا تھا۔ شام کے چار بجے چٹھا بٹ جاتا تھا۔ غریبوں کا پیسہ پیسہ واجب الادا مل جاتا تھا۔ لال قلعے کے لاہوری دروازے سے شہر کے لاہوری دروازے تک بازار ٹٹیوں اور جھونپڑیوں میں لگا دیا جاتا تھا جس میں جو، گیہوں، جوار، باجرے کے آٹے سے لیکر قسم قسم کی جنس کپڑا، اتر کاری، کابل و کشمیر کے میوے تک ملتے تھے۔ حکم یہ حکم چلا آتا تھا کہ اردو بازار میں ہر قسم کی اشیاء کی دکانیں اضافہ ہوتی رہیں تاکہ غیر ملکوں کے کاریگر جو اپنا دیس چھوڑ کر پردیسی بنے ہیں وہ تکلیف نہ پائیں اور اپنے وطن کی ہر شے اور غذا انھیں میسّر ہو۔

شہر کا نقشہ بنا کر اس کے حصّے کر دیئے گئے۔ شاہجہاں نے ان حصوں کو اپنی اولاد پہ بانٹ دیا تھا، فرمایا کہ لاگت خزانے سے ملے گی۔ اپنے حصّے میں عمدہ عمدہ مکانات اور محل بنوالو تاکہ نیا شہر اچھی اچھی عمارتوں سے آراستہ ہو کر آبادی کی صورت پکڑے۔ چنانچہ دکن کا حصہ اورنگ زیب کے اہتمام سے زیبائش پانے لگا۔ کشمیری دروازے کے قطعہ کو دارا شکوہ نے فلک شکوہ قصر و ایوان سے سنوارا۔ چاندنی چوک کے ٹکڑے کو جہاں آرا بیگم کے غلام نے جو ناتواں تخلص کرتا تھا، باغ گلشن اور حماموں سے رشک فردوس بنایا۔ نتواں کا کوچہ اسی ناتواں کی یادگار ہے۔ جامع مسجد کی تعمیر نواب سعداللہ خاں وزیر کے سپرد تھی۔ اس کی نیویں ہی بھری گئی تھیں جو

میر تعمیر، جس کی سپردگی میں جامع مسجد کا نقشہ تھا یکا یک مع نقشہ کے غائب ہو گیا اور مسجد کی تعمیر کا کام رکا پڑا رہا۔ اس امر کی خبر پا کر شہنشاہ ناخوش ہوئے۔ حکم صادر فرمایا کہ جو شخص اس کافر منش مسلمان کو جس نے خانۂ خدا کی تیاری میں اڑا اٹکایا ہے، پکڑ کر لائے گا، اسے بہت کچھ انعام دیا جائے گا، مگر وہ بندۂ خدا ایسا روپ ہوا کہ تین برس کسی نے اس کی جھلک نہ پائی۔ تین برس کے بعد دربار شاہی میں حاضر ہوا۔ حضور والا نے فرمایا کم بخت یہ کیا حرکت تھی۔ اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ جامع مسجد کی عمارت بہت بھاری ہوگی نئی بنیاد پر ایسی عمارت کا لے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ برسات کا پانی نیو میں مرتا اور اس کے ساتھ در و دیوار نیچے کھسکتے، ڈاٹیں، کمانیں، محرابیں جھک جاتیں۔ سرکار کے لاکھوں روپے پر پانی پھرتا اور میری آبرو کے ساتھ جان بھی جاتی۔ نیک نیتی اور مصلحت سے فدوی روپوش ہو گیا تھا۔ تین برساتیں کھا کر نیو لو بالاٹ ہو گئی ہے اب جو عمارت اس پر کھڑی ہوگی، صدیوں تک کھڑی رہے گی۔ حضور کو اختیار ہے فدوی کی جان بخشی ہو یا سزا دی جائے۔

بادشاہ نے اس کے عذر کو غور سے سن کر اس کی خطا معاف فرمائی اور خلعت سے سرفراز کیا۔ غرض جامع مسجد نواب سعد اللہ خاں کے اہتمام سے تیار ہونے لگی جو نواب صاحب کو قولنج ہوا اور وہ جنت کو سدھارے۔ بہر حال جامع مسجد، لال قلعہ، اور شہر بن گیا۔ حضور والا نے دیوان خاص میں تخت طاؤس پر جلوہ افروز ہو کر جشن ماہتابی منایا اور ایک فرمان جاری کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ فخر البلاد جہان آباد عرف شاہجہاں آباد میں جو رعایا آباد کی گئی ہے اس میں خوشحال کم اور اہل حاجت زیادہ ہیں، پھر ان میں کاریگر ہیں، بیمار ہیں، پردہ نشین عورتیں ہیں جو برقع اوڑھ کر

کبھی باہر نہیں نکلتیں اور بغیر سودے سلف کام نہیں چلتا۔ اس واسطے میں حکم دیتا ہوں کہ ترکاری فروش، قصائی، میوہ فروش، کسیرے، گندھی، تانبے والے، موچی، کمہار، اُپلے ایندھن بیچنے والے، حلوائی، بساطی، پارچہ فروش، منہیارنیں اپنے اپنے سامان خوانچوں میں لگا کر یا گٹھریوں میں باندھ، کندھے پر رکھ کر گلی کوچے اور محلّے محلّے میں پھرا کریں اور اپنی اپنی جنس کا نام لے کر آواز لگائیں۔ بزاز کہے ''نینو، لٹھا، ڈوریہ، ململ'' مچھلی والا کہے'' لو ماچھ'' کھٹ بنے، بڑھئی، لوہار اپنے اپنے پیشہ کا نام لے کر پکاریں، یہاں تک کہ موری دھونے والے پکار کر کہیں کہ موری دُھلوا لیجیے'' تاکہ گھر بیٹھے اہلِ حاجت کی ضرورت پوری ہو، کوتوالی کے برق انداز ان لوگوں کے ساتھ رہیں اور شہر میں انھیں گشت کرائیں'' تاکہ گاہک اور سودا بیچنے والے اس طور کے لین دین کے عادی ہو جائیں اور بیچنے والوں کو روزی، مول لینے والوں کو سامان لینے کے لیے بازار نہ جانا پڑے۔ ہر قسم کی چیزیں ان کے دروازوں پر مہیا ہو جائیں۔ جیسی نیت ویسی برکت شاہجہاں کی یہ تدبیر ایسی راس آئی کہ آج تک اس اُجڑے دیار میں لینے والی، بیٹی کا سارا جہیز، اپنے دروازے پر کواڑ کی آڑ میں کھڑی ہو کر، مول لے لیتی ہے۔

کہتے ہیں محمد شاہ جو رنگیلے کے نام سے پکارے جاتے تھے اور اخیر زمانے میں والیِ سلطنتِ مغلیہ قرار پائے، ایک رات سرور کے عالم میں اُس درگاہ کے اندر مع جوتیوں کے گھس گئے جس میں بزرگوں کے تبرکات، امیر تیمور کے عہد سے جمع کیے گئے تھے۔ یہ درگاہ لال قلعہ ہی میں تھی، اس بے ادبی اور گستاخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ نادر شاہ آیا اور شاہجہاں آباد کو اُجاڑ کر چل دیا۔ مرہٹوں، روہیلوں افغانوں نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور قلعہ کو ننگا بُوچا کر کے اپنی اپنی راہ

ہو لیے۔ مغلیہ سلطنت گھٹتے گھٹتے لال قلعہ کی چار دیواری تک ٹھٹھر کے رہ گئی۔ پھر فرنگیوں کی سازش سے کوئی راجہ، کوئی حاکم، کوئی رئیس، کوئی نواب عہدہ بر آ نہ ہو سکا۔ شاہ عالم بادشاہ نے فرنگیوں کو بیٹا بنا لیا۔ ان کی دی ہوئی پنشن کو اللہ آمین کر کے قبول کیا۔ دبی بلی چوہوں سے کان کٹاتی ہے، مرتا کیا نہ کرتا۔ جان بچی نو لاکھوں پائے۔ فرنگی موذیوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا اور کچھ عرصہ بعد ان کے ہاتھوں جہاں آباد میں ایسا غدر پڑا کہ خلق خدا تراہ تراہ پکار اٹھی۔ کلمہ گویوں کو پکڑ پکڑ کر پھانسیوں پر لٹکایا گیا۔ جامع مسجد میں گورا پلٹن کے گھوڑے بندھے، تمام شہر مکینوں سے خالی ہو گیا۔ شرفا اپنی ابرو بچا، بھرے پُرے گھر بار چھوڑ راتوں رات فصیل سے باہر نکل گئے۔ غرض عبرت کا ایسا بازار گرم ہوا جسے سنانے کے لیے لوہے کا کلیجہ اور پتھر کا دل چاہیے۔

•

"اے ہے میاں، غدر کی، للہ نہ پوچھو۔ اے اللہ دشمن کو نہ دکھائیو۔ برس دن ست ہی ست پر گذری۔ استانی کے ہاں بیں تھی کہ اتنے میں میرے ابا جن کا نام الٰہی بخش تھا اور قلعہ میں کبوتروں کو دانہ دینے پر نوکر تھے، ہانپتے کانپتے، بھاگے ہوئے آئے۔ کنڈی کھٹکھٹائی اور مجھ سے کہا کہ جلدی گھر چل، شہر میں بلوا ہو گیا ہے۔ رات کو پانچ آدمی آئے بہتیرا شہر کا دروازہ کھلوایا، پہریدار نے نہ کھولا۔ صبح ہوتے ہوتے اور بیسیوں آدمی آ ملے۔ بادشاہ نے کہوایا بھی کہ ارے کمبختو کیوں میری ضعیفی میں مٹی پلید کراتے ہو، لیکن انھیں ایک مانتی تھی نہ مانی۔ غرض دروازہ کھلا وہ گھس آئے۔ قلعہ میں ہنگامہ ہے۔ بادشاہ سلامت کو قید کر لیا ہے۔

اور سارے محلّوں کو گھیر لیا ہے اللہ ہی اللہ ہے۔ جو خیر ہو استانی جی میری اُن کے گھبرا گئیں۔ گھر میرا لاہوری دروازے صفیلوں میں تھا۔ تھوڑے دنوں تو وہیں رہے لیکن پھر جو گولا پڑا تو میرے نانا جن کا نام خدا بخش تھا آئے اور مجھے اور میری ماں کو جن کا نام اکمل النساء تھا لیکے چتلی قبر اعظم خاں کی حویلی میں اپنی بہن لاڈو خانم کے ہاں چھوڑ گئے۔ تین مہینے ہم یہاں رہے۔ ابّا میاں افیون کے عادی تھے، وہ کلموئی آئی نہ میسر۔ ان کا بُرا حال ہوا۔ ایسا کہ لبوں پہ دم آگیا۔ گھر میں کوئی آدم نہ آدم زاد جو پانی کی بوند بھی حلق میں ٹپکائے۔ مٹکے سوکھے، پانی کی بلُوں بلُوں۔ اتنی ان میں سکت نہیں جو باہر نکل سکیں جب مارے پیاس کے بے تاب ہوئے تو بڑے روئے اور گڑگڑائے۔ روئے جو سہی تو وہ موسلا دھار پانی پڑا اور اتنا برسا کہ دو کٹورے پانی کے بھر گئے۔ انھوں نے وہ پی لیے۔ گورے گھس آئے تھے اور پانی پینے سے ان میں ذرا دم آیا رات کو چپکے سے نکل گھسٹتے گھسٹاتے میرے نانا کے مکان تک آئے۔ یہاں مارے ڈر کے میرے نانا نے دروازے کو تیغہ دیدیا تھا۔ ابّا نے جو دروازے میں تیغہ لگا پایا تو بڑے پریشان ہوئے لیکن رات کو میری نانی تہجد کی نماز کو اٹھتی تھیں اور خالہ کی آنکھ ڈر کے مارے نہیں لگی تھی۔ ابّا نے جو آواز دی نانی اور خالہ دونوں کی دبدبوں ڈر گئیں۔ نانا کو اٹھایا۔ انھوں نے آواز پہچان کے کہا کون ہے؟ الٰہی بخش؟ ابّا نے کہا کہ ہاں باوا میں ہوں۔ نانا نے کہا پچھواڑے سے آجاؤ، ہمسائی کی کھڑکی میں سے۔ ابّا نے کہا میں تو ہل بھی نہیں سکتا گھٹنیوں گھسٹتا تو یہاں تک آیا ہوں۔ اب تو ذرا دم نہیں ہے نانا گھبرائے۔ باہر جا پیڈی پہ ڈال، اندر لائے۔ صبح ہوتے ہی چتلی قبر آئے۔ اماں کو لے گئے۔ وہ گئیں تو دیکھا

سارے لت پت ہو رہے ہیں۔ انھوں نے جلدی جلدی پاجامہ اُترواد ُھلا دھلو صاف کیا۔ آدھے شہر میں گورے گھس آئے تھے۔ ابا کی چارپائی انگنائی میں بچھی تھی اور سب اندر دالان میں تھے۔ چھت پہ دھم دھم کی آواز ہوئی، سب کے سب ڈر کے سہم گئے۔ اتنے میں ایک دھڑاکے کی آواز ہوئی۔ اوپر کی تختہ بندی کی دیوار، نگوڑے گورے دیوار پر سے جھک کے نیچے گھر میں جھانکتے تھے کہ ساری تختہ بندی نیچے آن پڑی۔ ابا کی چارپائی نیچے ہی تھی ایک دھاڑ ماری اور پٹکا بھی نہ کھایا۔ چادر جو اوڑھے تھے اسی میں لپیٹ نانا دو تین محلے کے مردوں کو لے، باہر دکان میں گڑھا کھود دبا آئے۔ لوٹتے ہوئے گوروں نے دیکھ لیا۔ نانا بڈھے پھونس، ایک ہی گولی میں فیصلہ ہو گیا۔ میری ممانی کے دو دہیز چنگی صندوق تھے۔ نانی اور خالہ نے انھیں توڑ نانا کو دوپٹوں میں لپیٹ مار امار گڑھا کھود زمین میں امانت رکھ دیا اور سب بھاگ کر چتلی قبر آ گئے۔ شہر میں گوروں کالوں کی لڑائی برابر جاری تھی۔ ہمارے پچھواڑے شہزادے جوان بخت کی سسرال تھی۔ گورے فارتی رات بھر ان کے دروازے کی زلفیاں کاٹتے رہے اور ہر ٹھناکے کے ساتھ ہمارے دم نکلیں۔ اماں، نانی اور سارے گھر کی عورتیں، مردوے کے نام تو چڑیا کا بچہ تک نہ تھا، قرآن شریف کھولے کھڑی چھت پر چڑھتیں اور گھڑی نیچے اُتر تیں، سب پڑھ پڑھ کر چاروں طرف دستک دیں اور بال کھول کھول کر دعائیں مانگیں کہ الٰہی مردوں کی جانوں اور عورتوں کی آبرو کا تو ہی والی ہے۔ بیبی زار و قطار روئیں۔ سامنے پہاڑی پر گولیاں سائیں سائیں جائیں۔ دھنا دھن، ٹھوں، ٹھائیں، ٹھنا ناکی آوازیں کلیجہ نکالے دیں۔ کس کا کھانا، کس کا پانی، جانوں اور آبروؤں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اور میاں اعمالوں کی شامت دیکھو کہ پہلے اچھے خاصے

نکل گئے تھے۔ سُنا تھا کہ بادشاہ جا رہے ہیں۔ ساری خلقت شہر سے ان کے ساتھ نکل رہی ہے۔ ہم عورتیں گھر سے حق تو حق تو کرتی نکلیں۔ مٹیا محل کے بازار سے لیکر جامع مسجد کی سیڑھیوں تک آدمیوں کا یہ حال کہ ہیں تجھ پر اور تو مجھ پر۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ جہاں پناہ بے چارے تام جھام میں سوار، ایک ایک آنکھ سے ہزار ہزار آنسو جاری بہہ بہہ کے نورانی مقیش سی داڑھی پہ آئیں۔ آپ رومال سے انھیں صاف کرتے ہوئے آثار شریف کی زیارت کر کے رخصت ہونے آئے تھے۔ پیچھے پیچھے قوال بادشاہ سلامت نے جو غزل اپنی بپتا کہانی میں کہی تھی، گاتے ہوئے، آدمی روتے روتے لوٹے جائیں اور وہ پیٹک بپتا پڑی کہ الحفیظ والاماں۔ کلیجے میں کس کی طاقت ہے جو بیان کرے۔ لے ہے۔ یاد پہ پھر جائے لوکا، اس کا اب ایک بول بھی یاد نہ رہا۔ میں نے تو خوب صاف سُنی تھی، کیونکہ پیچھے سے جو ریلا آیا تو نانی بے چاری گر گئیں اور میرا ہاتھ اماں پکڑے ہوئے تھیں۔ ہم دونوں جنیاں تام جھام تک زمین سے ادھر جا پہنچے۔ جان نانی میں پڑی تھی کہ الٹی کچل گئیں، یا کیا ہوا۔ پھر پلٹے انھیں ایک جگہ پڑا پایا۔ ساتھ لے کر گھر واپس ہوئے۔ پھر تو گورے گھس ہی چکے تھے۔ نکلنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ لیکن جب جواں بخت کی زلفیاں کاٹ وہ اندر گھسے اور عورتوں کے رونے پیٹنے کی آواز آئی تو پھر جو جس حالت میں تھا نکل کے بھاگا۔ ننگے پیر، ننگے سر کس کا برقعہ، کس کی چادر، گرتے پڑتے، رستہ معلوم نہیں کہ کدھر جائیں۔ جانے کدھر کے کدھر نکل گئے۔ ہزاروں عورتیں، مردوے، بچے کچے چیختے چلاتے، روتے بلبلاتے ادھر اُدھر بھاگتے پھرتے، ہم سب بھی ان میں مل گئے۔ جانے لاہوری دروازہ تھا کہ موری دروازہ یا خدا جانے کہ کابلی دروازہ تھا، غرض ہوش نہ تھا کہ کہاں جاتے ہیں۔

بازار لاشوں سے پٹے۔ جگہ جگہ خون کے تھتے تھے، قدم قدم پہ سر اور دھڑ پڑے ہوئے۔ دروازے کے باہر جو نکلے پہرے داروں نے جو جس کے پاس تھا دھروا لیا۔ اوڑھنے کے کپڑے لتے چھین لئے۔ سڑک کے دونوں طرف کپڑوں کے انبار لگے۔ رات، ایک پرانا تہہ خانہ تھا، وہاں بسر کی، لیکن آنکھوں میں نیند کہاں پلک سے پلک نہ لگی۔ ساری رات لرزتے گذری۔ رات بھر شہید مرد ادھر سے اُدھر پھرتے دکھائی دیں تلواروں کے کچاکے اور خون کے فراٹے کی آواز کلیجہ دہلائے دیتی تھی۔ پہلے تو میں ضبط کرکے بیٹھی رہی آخر ایک چیخ ماری اور رونا شروع کیا۔ میری چیخ اور رونے سے جو بچے سو رہے تھے ان کی گھگھی بندھ گئی۔ پھر جو کہرام مچا تو توبہ ہے۔ بڑے بوڑھے ایک ایک کا منہ تکیں اور بچے بلک بلک کر اور بڑوں سے لپٹ لپٹ کر روئیں۔ مردوؤں کو موت اور ہاتھ بھر کی رسی اور درختوں کے جھونٹے دکھائی دیں۔ تین دن میں مرتے گرتے تغلق آباد پہونچے۔ وہاں نگوڑے گنواروں نے ظلم توڑے۔ سب کو پکڑ لیا اور کہا کہ جب تک آدمی پیچھے روپیہ نہ لے لیں گے ہرگز نہ چھوڑیں گے۔ جن کے پاس تھا، دے کے چھٹکارا پایا۔ یہاں کیا خاک دھری تھی جو ان کے دیدوں میں جھونکتے۔ سارے دن ساری رات بندھے بیٹھے رہے۔ کھائے ہوئے تیسرا دن تھا۔ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو اور پانی کے ایک ایک گھونٹ کو ترسیں اور میسر نہ آئے۔ آخر خدائی خواروں نے ہار جھک مار چھوڑ دیا۔ برسوں جنگل کی خاک چھانی، میاں جانی، بیان کرنے کو کس کی چھاتی لاؤں۔ دل میں طاقت نہیں۔ الٰہی اب نہ دکھائیو اور اس دن کو موت دیجیو۔ گوروں کے سلوک جو جو انھوں نے مرد عورت سے کئے، بیان کروں تو بکٹی ہی جاؤں اور گھسٹنی پھروں۔ شہزادیوں کی تو وہ خواری تھی کہ کیا کہوں۔ جو بیبیاں پکڑے کے

سڑکوں پہ گھسیٹتے تھے۔ جھوٹوں کوئی کسی کو شہزادہ بتا دے بس اس کی اجل تھی۔ لیا، گھوڑے کی دُم سے باندھا اور ریمگا یا گھوڑے کو، یا سڑک پہ ڈالا اور بیلن چلا دیا۔ ہڈیاں پس کر ملیدہ ہو جاتیں۔ قیامت تھی قیامت نہ داد نہ فریاد۔

یہاں تک کہہ کے درویش نے ایک لمبا سانس لیا۔ چلم اُٹھا کر ٹھیب سے اُپلا نکالا اور اُپلے کو مٹی کی ٹھکلی پہ ٹکا کر یوں گویا ہوا کہ یہ کہانی اس نے کیپڑے والی افضل النسا کی زبانی سُنی تھی سو بے کم و کاست بیان کر دی۔ پھر گڑ گڑی کے دو چار کش لے کر فقیر جب تازہ دم ہوا تو اس نے آگے حکایت یوں بیان کی۔

کہنے والے کہتے ہیں اور سُنانے والوں سے جو سُنا ہے وہ نقل کرتا ہوں۔ یہاں تک تو داستان غیروں کی بیان ہوئی تھی۔ اب قصۂ اپنوں کے مظالم کا سُنئے، محمد علی، گاندھی جی، ڈاکٹر انصاری، نہرو، آزاد اور بہت سے دوسرے لوگوں کی کوشش سے ملک آزاد ہوا۔ دلّی کے لال قلعے سے انگریز دھکّے دے کے نکال دیئے گئے۔ اپنا راج ہو گیا مگر فرنگی کمبخت جاتے جاتے ہندو اور مسلمانوں کے بیچ سیہہ کا کانٹا رکھ گئے۔ آزادی کے بعد وہ نحوست چلے اور ایسی افراتفری مچی کہ توبہ ہی بھلی۔ اچھا خاصا آدمی جانور بن گیا۔ دلّی بطور خاص نشانہ بنی۔ پنجاب سے نکالے ہوئے لوگ یہاں پہنچے تو ان کی حالتِ زار دیکھی نہ جاتی تھی۔ نزلہ بر عضوِ ضعیف نتیجہ کے طور پر دلّی والوں کی شامت آئی۔ توبہ توبہ، تھو تھو شیطان کے کان بہرے اب سے دُور، اُن دنوں دلّی والوں پر ایسا بپتا وقت پڑا کہ جب خیال آتا ہے تو سارے بدن کی جان نکل جاتی ہے۔ غدر میں اتنا تو تھا کہ لشتم پشتم فصیل کے باہر نکل گئے تو امان مل گئی مگر ان دنوں تو ملک کے کونے کونے میں غدر اودھم مچا تھا۔ ہر طرف چھری چاقو،

کر پائیں ناچتی دکھائی دیتی تھیں۔ غرض ایک موجۂ خوں رواں تھی۔ وہ بیرا مچی کہ مرد، عورت، بوڑھے، بچے سب کھیرے ککڑی کی طرح کاٹے جانے لگے۔ دتی کے ان بازاروں میں جہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا ہُو کا عالم ہو گیا۔ جہاں چھمی ہن برساتی تھی، وہاں بھیروں ناچ رہا تھا۔

رات دن کرفیو لگا رہتا تھا۔ فوجیں گشت کیا کرتیں اور فوجی جوان اونچی نیچی ناکوں پر تعیناتی کھڑے رہتے تھے۔ ٹھائیں ٹھائیں گولیاں چلتیں۔ جس کی آتی وہ مر جاتا باقی دھڑا دھڑ گرفتار ہوتے۔ گھروں کی تلاشیاں ہوتیں۔ ترکاری کاٹنے کی چھری بھی کسی کے ہاں نکل آتی تو گھر کے سب مرد گرفتار کر لئے جاتے تھے۔ پھر بھی ہر طرف چپکے چپکے مقابلوں کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ کُپّیاں بنوائی گئیں۔ چھتوں پر اینٹیں چنوائی گئیں۔ لال مرچیں اور تیزاب کی بوتلیں جمع کی گئیں۔ اونچے اونچے مکانوں پر لال اور سبز رنگ کے قمقمے لگائے گئے کہ جب لال بتیاں جلیں تو ہوشیار ہو جائیں کہ خطرہ ہے اور جب سبز بتیاں جلیں تو سمجھیں کہ خطرہ ٹل گیا۔ ہر محلے کے سرے پر لوہے کے دروازے چندہ کر کے چڑھوا دیے گئے۔ سب کو تاکید کی گئی کہ کم از کم ایک ہفتہ کا راشن گھر میں رکھیں۔ محلے کے جو سر دھرے تھے ان سے کہا گیا کہ تم دس دس بیس بیس بوریاں گیہوں کی اپنی حویلیوں میں محفوظ رکھو۔ وقت چونکہ سب پہ پڑا تھا اس لئے سب چھوٹے بڑے سر جوڑ کر کام کر رہے تھے۔ لال بتیاں جلتیں تو گلیوں میں سارے مرد لاٹھیاں، پلنگ کے سیرے، پٹیاں، پائے اور حد تو یہ ہے کہ گھبراہٹ میں پھکنی اور دستپناہ تک ہاتھ میں لے کر نکل آتے۔ عجیب بھیانک سماں تھا۔ اوّل اوّل تو بڑا ہراس طاری ہوا۔ کئی راتیں آنکھوں میں کٹیں۔ پھر اس کے بعد یہ ایک معمول پڑ گیا اور لوگوں کے دلوں سے خوف کا عنصر

نکل گیا۔

فصیلِ شہر کے گرد و نواح میں ہر طرف لوٹ مار، قتل و غارت گری کا ایسا بازار گرم ہوا کہ وہاں سے لوگ نکل نکل کے جامع مسجد پہ آنے لگے۔ کیمپ بن گئے۔ جو لوگ گھروں سے نکل کر بھاگ گئے وہ چوراہوں پہ جلتے الاؤ میں زندہ جھونک دیئے جاتے۔ کان گنہگار ہیں، اللہ دشمن کو یہ منظر نہ دکھائے۔ گھر کے گھر تباہ ہو گئے۔ کسی کے بچوں کا پتہ نہیں، کسی کی بیوی غائب۔ کسی کے بوڑھے ماں باپ رہ گئے۔ خواتین ننگے سر ڈنڈاتی ڈنڈاتی پھر رہی تھیں۔ کہاں کی عزت، کیسا وقار۔ اپنی جانوں کا ہوش تو تھا نہیں۔ کیمپوں میں جامع مسجد اور مشرقی رخ کے سنگھاڑے ان بے گھروں سے بھر گئے۔ شہر والوں نے چندہ کر کے کھانا پکوایا اور ان میں تقسیم کیا۔ جو لوگ سال بھر میں لاکھوں روپیہ خیرات کرتے تھے وہ دو دن میں روٹیوں کے محتاج ہو گئے۔

سبزی منڈی کے جیالے رائیں اور ملتانی ڈھانڈے کے بندھانی قوت سے بھڑ گئے۔ ننگ آمد بجنگ آمد۔ کچھ دیر تو نہتوں نے مقابلہ کیا مگر خالی ہاتھ یا ڈنڈوں سے کوئی لڑائی ہوتی ہے۔ فوج نے جو مشین گنوں اور اسٹین گنوں سے گولیوں کی بارش کی تو کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ غرض یہ کہ آدمی چنوں کی طرح بھون دیئے گئے۔ جو بد حواس ہو کے بھاگے تو گٹھریاں اور پوٹلیاں چھینیں۔ جو زیور پہنے ہوئے تھے ان کے زیور نوچ لئے گئے یا بیویوں کے ہاتھ کان تک غائب۔ پھر بھی جن کی زندگی تھی وہ کسی نہ کسی طرح پناہ گاہ تک پہنچ گئے۔ کہاں تک اس کی تفصیل بیان ہو۔ عجب زندگی کا دور تھا۔ اپنا گھڑا گھر دے کے آپ ہی لاچاروں مر گئے۔

اس ہنگامے میں ہندو مسلمان کی تخصیص نہیں تھی۔ دونوں ہی آنچ سے باہر

تھے۔ مسلمانوں کو جب معلوم ہوتا کہ آج سات مسلمانوں کے چھُرے گھونپے گئے ہیں تو وہ بھی سات گھنٹا ہی کم کے حساب چُکتا کر دیتے۔ کرے کوئی بھرے کوئی۔ گدھے پہ بس نہ چلا گدھیا کے کان اینٹھے۔ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ دِلّی میں ہمیشہ سے ہندو مسلمان ساتھ ساتھ رہتے تھے، یہ میر صاحب کا گھر ہے اور یہ لالہ جی کی حویلی ہے۔ شام کو ایک ساتھ دیوان خانوں کی محفلیں جمتیں۔ کڑ والوں اور شریف خاندانوں کی دوستی ضرب المثل بنی ہوئی تھی۔ سُنا ہے ان کے بزرگ ٹوپی بدل بھائی تھے۔ اب جب سے فسادات کی ربا پھیلی تھی تو ہندوؤں کے محلّے سے مسلمانوں کا اور مسلمانوں کے محلّے سے ہندوؤں کا گذر مخدوش ہو گیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ ملنے جلنے والوں کی آنکھیں بدل گئی تھیں وہ تو اب بھی ساتھ بیٹھ کر اس مصیبت سے نپٹنے کی تدبیریں کرتے تھے بلکہ اس لئے کہ غنڈوں نے گلی گلی اپنے جال بچھا رکھے تھے۔ شرفا بے بس ہو کے رہ گئے تھے۔ کھانے پینے کی جو تنگی ہوئی تو لوگوں نے پالتو جانور کاٹنے شروع کر دئے۔ اس غم کو وہی سمجھے گا جو دلّی والوں کی طبیعت کو جانتا ہوگا۔ سوکھی روٹیاں پانی میں بھگو کر کھائی جا رہی تھیں گیہوں، جَو، باجرہ، مکّی جو کچھ میسّر آتا سِل پر پیس کر روٹی پکائے جاتے تھے۔ چکّیوں کا رواج دلّی میں مدتوں سے نہیں رہا تھا بازار میں گیہوں پسوایا جاتا یا پِسا پسایا آٹا بنئے کی دکان سے آ جاتا تھا۔ بازار بند پڑے تھے۔ گیہوں اُبال کر اور نمک چھڑک کے پیٹ کا دوزخ بھرا جاتا تھا۔ بدہضمی اور پیچش کی شکایت عام ہو گئی۔ ڈاکٹر اور دوائیں ملنی مشکل، لوٹ پوٹ کر آپ ہی کھڑے ہو جاتے تھے۔ کم بختی میں جان بھی مشکل سے نکلتی ہے۔

ایک روز صبح صبح ہمارے محلّے میں خلیفہ بنّو نے آ کر آواز دی۔ خلیفہ

بڑے جی دار آدمی تھے۔ لکڑی چلانے میں ان کا جواب نہیں تھا مگر بڑھاپے نے کس بل توڑ دیئے تھے۔ کہتے تھے میاں۔ یہ میری ہانہہ کیا دیکھو گے۔ کدی جوانی میں دیکھتے، لطف آجاتا۔ چرپائی کے بیچ تبو تر چھوڑ دو، جہاں ہے جو نکل جائے۔ ہانہہ قلم کرا دیتا۔ اب بھی خاک چاٹ کر کہتا ہوں کہ دس پانچ کے بس میں تو آنے کا نئیں۔ خلیفہ نے آواز دی تو جی سُن سے ہو گیا کہ نہ جانے تحتیے پہ کیا اُفتاد پڑی۔ ہانے ڈرتے ڈرتے جا کر ان سے پوچھا کہ خلیفہ خیر تو ہے۔ بولے میاں اللہ خیر ہی رکھے گا۔ لینا ذرا یہ گھر میں دے آؤ لپک کے۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنی شالی رومال کے نیچے سے دو سیر گوشت کا دونا نکال کر تھما دیا۔ پوچھا خلیفہ یہ کہاں سے لائے اور کتنے کا لائے۔ بولے میاں آج میں نے اپنے تڑکی کو حلال کر دیا۔ دیکھنا گوشت کیسا نفیس ہے۔ چاندی کے ٹکڑے ہیں چاندی کے ٹکڑے مجھ سے اس کی بے بسی دیکھی نہ گئی۔ آدمیوں تک کو کھانے کو مل نہیں رہا ہے کہاں سے کھلاتا۔ کھلا مس چنا اور کو دودھ جلیبیاں کھلا کر پالا ہو اسے گھاس تک نصیب نہ ہو۔ لعنت ہے اس کے جینے پر۔ اتنا کہہ کے خلیفہ نے منہ پھیر، جلدی جلدی قدم اُٹھاتے چلے گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

دلّی کے اُجڑنے اور بسنے کی داستان بڑی عبرت انگیز ہے۔ کہاں میری زبان میں طاقت اور گفتار میں طلاقت کہ شہر مذکور اس کا آپ کے آگے بیان کروں، بڑوں سے جو کچھ سُنا تھا، اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کہہ دیا۔ ناصر نذیر فراق، یا فرحت اللہ بیگ ہوتے تو باتوں باتوں میں دلّی کی موہنی تصویر کھینچ دیتے پھر آپ کو اندازہ ہوتا کہ اللہ اللہ اس شہر کی عظمت کا کیا ٹھکانا تھا اور اس کے مٹنے کا غم

آپ کی آنکھوں کو بھولانا۔ میں ٹھہرا زبان کا اپاہج، بات کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے
جیسے اردو ان پہ شوطا چڑھتا ہو۔ کیا خاک فسانۂ یارانِ کہن نقل کروں گا۔ ہاں ایک
سرسری سا خاکہ ضرور کھینچ دیا ہے کہ جس میں اہلِ دل اپنے خونِ جگر کا رنگ بھریں
تو اُجڑے دیار کے مٹے ہوئے نقوش آپ زندہ کر سکتے ہیں۔ بٹوارے کے بعد اس
شہر کے چاہنے والے، شاہجہاں کی دیگ کی کھرچن، خاکِ پاک، دہلی کے دلدادگان
بھی افراتفری میں یہاں سے نکل گئے۔ نہ شاہد احمد دہلوی رہے نہ ملا واحدی نہ
اشرف صبوحی رہے نہ خواجہ محمد شفیع۔ زمین بدل گئی، آسمان بدل گئے مگر ان
صاحب دلوں کے مزاج نہیں بدلے۔ یہاں سے ہزاروں میل دور بیٹھے یہ لوگ زندگی
بھر اس سرزمین کے ترانے گاتے رہے۔ کوئی ملنے جاتا تو جامع مسجد کی سیڑھیوں
پر بوسہ دینے کی فرمائش کرتے۔ کسی سے کہتے میاں دلی جاؤ تو وہاں کی خاک کا تھوڑا تحفہ
بھیج دینا۔ کوئی اس غم میں مر گیا کہ اسی اُجڑے نگر میں داعیِ اجل کو لبیک کہوں
اور کسی نے جان دی تو اس کی آنکھیں حسرتِ دیدارِ دلی میں کھلی رہ گئیں۔

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے
کبھی روئے، کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

دلی کی بربادیوں کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا، بلکہ ہنوز جاری ہے۔ فسادات
کے بعد امن و امان ہوا تو لوگ اِمی جمی سے رہنے لگے۔ ناگہانی ایک آفت بموں کے
پھٹنے کی آئی۔ سان نہ گمان، کبھی یہاں دھماکا ہو گیا کبھی وہاں دھماکہ ہو گیا۔ جانیں
تلف ہوتیں۔ خوف و ہراس پھیلتا اور ذرا دیر میں گہما گہمی والے بازاروں میں
قبرستان کا سا سناٹا ہو جاتا تھا۔ اربابِ حل و عقد نے اس گتھی کو سلجھانے کی بہتیری

کوشش کی۔جگہ جگہ برقی قمقمے لگا کے رات کو دن بنا دیا۔مسلح پہرہ دار مجرم کی ٹوہ میں پھٹوں پہ ہمہ وقت ٹہلتے رہے، مگر سوائے افسوس، کچھ ہاتھ نہ آیا۔بم پھینکنے والا کم بخت چھلاوا تھا یا خدا جانے کوئی بدارا واح تھی کہ ذرا سراغ نہ ملتا تھا۔ تھیلیوں، بچکیوں، جیبوں سب کی تلاشی ہوئی، مگر نہ کچھ پتہ چلنا تھا نہ چلا۔ یوں سمجھئے جس طرح دلی کی باؤلیاں بھینٹ لیتی تھیں، یہاں کے بازار بھی بھینٹ لینے لگے۔سید رفاعی کی مسجد تلے جوان جہان اندے دالامرا نو لوگوں سے اس کی شکل نکل کرتی لاش دیکھی نہ گئی۔ہر طرف کہرام مچ گیا۔پھر اس کے بعد اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ یہ ہنگامہ سدا کے لیے فرد ہو گیا البتہ مدتوں بعد رفتہ رفتہ لوگوں کے ذہنوں سے اس کی دہشت مٹ ہوئی تھی۔

جامع مسجد بانکوں کا علاقہ ہے۔یہاں والے ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ انگریزی سرکار تھی تو اُس سے دُون کی لیتے تھے، اب اپنا راج ہے تو اس سے آئے دن ٹھنی رہتی ہے۔دلوں میں کینہ رکھنے کے یہ قائل نہیں ہیں۔جب ذرا غبار بھرتا ہے تو جھٹ نکال لیتے ہیں۔محرم کے جلوس اور عید میلادالنبی کے موقعہ پر کتنی بار حکام سے دو دو ہاتھ ہوئے۔جانوں کا زیاں ہوا سو ہوا گھر سا کھ تو رہ گئی۔غالب نے کہا تھا کہ دلی اب دلی کہاں، کیمپ ہے، چھاؤنی ہے، نواں کے سامنے تو یہ چند دنوں کی بات تھی، مگر ہم سے پوچھئے تو ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے آج تک ایسا ہی دیکھا۔گوروں کے بارک تو ہمارے بڑوں نے کبھی دیکھے ہوں گے۔موئی کالی پلٹنیں ہم روز دیکھا کرتے ہیں۔ایسے ایسے ہتھیاروں سے لیس جیسے کوریا کی جنگ لڑنے جاتے ہوں۔بھاری قدموں کی چاپ سے دلی کے گلی کوچے

اس طرح روندے کہ آخر یہاں ویرانی برسنے لگی۔ آبادیاں دیکھتے دیکھتے معدوم ہوگئیں اور جہاں بلبلوں کے آشیانے تھے، وہاں اب زاغ و زغن کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

وقت کے ساتھ ہر شئے پہ زوال آتا ہے۔ کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد سو اب دلّی بھی بوڑھی ہوگئی۔ محلات گرنے لگے، حویلیاں سجدہ ریز ہوگئیں، مکین تو کب کے فنا ہوگئے تھے اب مکان بھی ڈھنے لگے۔ وہ گلی کوچے جو کبھی اوراقِ مصوّر کہلاتے تھے گندگی کے پوٹ سے گھناؤنے ہوگئے۔ کیوں نہ ہوتے کثرتِ خلائق کا بھلا کوئی ٹھکانا ہے، جہاں ایک کنبہ رہتا تھا، وہاں سینکڑوں کنبے آباد ہیں۔ دنیا بھر کے لوگ دلّی میں آن کے آباد ہوگئے۔ پرانے لوگ کہتے ہیں کہ دلّی باہر والوں کی ماں اور یہاں والوں کی بیوی ہے۔ ان کے پیٹ ٹٹولتی ہے اور ہماری جیبیں، خیر یہ تو ایک بات کہنے کی ہے۔ مگر ہوا یوں کہ دلّی کی کاروباری حیثیت دن بدن بڑھنے لگی۔ پیسے والوں نے جگہ جگہ قبضے کر لیے، پگڑیاں دیں اور جگہیں لیں۔ ان کا بھی کچھ قصور نہیں۔ اب جو دیکھیے، دلّی ایک منڈی بن گئی۔ گلی گلی، محلّے محلّے تاجر اور کارخانہ دار گھس آئے۔ سوا ان مشکلوں سے دلّی والوں کا جینا دو بھر ہوگیا۔ دم ناک میں آنے لگا۔ شور و غوغا ہوا تو پرانے دلّی والوں نے ہائے واویلا مچایا۔ ان کی دیکھا دیکھی سرکاری حکام بھی چلّانے لگے کہ دلّی کی حالت سدھارنی چاہیے۔ سب نے کہا تمہارے منہ میں گھی شکر، نیکی اور پوچھ پوچھ، اس سے اچھی کیا بات ہے۔ ایک پاکھنڈی حاکم کھڑا اور پڑا اپنے آپ کو پیٹنے لگا۔ جہان آباد کا ایسا بھوراس مونڈی کاٹے کو لگا کہ اس نے ایک کتاب شہر کی تاریخ پہ لکھ ڈالی۔

وہ جو مثل مشہور ہے کہ ماں سے زیادہ چاہے، پھاپھا کٹنی کہلائے۔ دلی کے پرانے گھاگ تو اس کی نیت تاڑ گئے مگر سیدھے سادے لوگوں کو اس نے باتوں میں لے لیا۔ دگیان بھون میں ایک بیٹھک بلائی اور ڈھونگ رچایا اور مگرمچھ کے آنسو بہائے کہ سارا شہر اسے اپنا ہمدرد سمجھنے لگا۔ اگلے دن شہر والوں کا کسی بات پہ پولیس سے جھگڑا ہو گیا۔ پولیس نامراد نہ جانے کب کی خار کھائے بیٹھی تھی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ لڑنے والے تو ادھر ادھر ہو گئے اور راہ چلتوں کی شامت آئی۔ چتلی قبر پہ اعظم خاں کی حویلی کے پاس جہاں چھجو دودھ والے کی دکان ہے وہاں ایک کوٹھے پہ چڑھ کر سنتریوں بند اوپچی جان بیٹھے پراتا وے ہو گئے۔ ایک لڑکی بچاری کے گولی لگی، باپ صدمے سے جاں بحق ہو گیا۔ اچھا خاصا گھر ذرا دیر میں ماتم سرا بن گیا۔ پھر جو کرفیو کا دورہ دورہ ہوا تو ہفتوں یہ عالم رہا کہ سائیں سائیں کل بازار میں رات دن اُلّو بولتا تھا۔ کھانا پینا، کام کاج، دکھ بیماریاں سب بند۔ ایک لڑکی مٹیا محل میں کوٹھے سے گر پڑی۔ دو چار آدمی اسے کندھے پہ ڈال اسپتال لے بھاگے۔ پھاٹک تک پہنچ کے دیکھتے ہیں تو سنگینیں لگی ہیں، ادھر ادھر بارسوخ لوگوں کے پاس گئے۔ سب نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ ماں باپ غریب کلیجہ پکڑ کے رہ گئے۔

سردیوں کے دن تھے۔ سپاہیوں نے ہاتھ سینکنے کے لیے جگہ جگہ چوراہوں پر الاؤ روشن کر رکھے تھے۔ کاٹھ کباڑ، کوڑا کرکٹ جو سڑک پہ پڑا تھا کام آ گیا۔ پھر دکانوں کے تختے جلنے لگے۔ اور ایک دن یہ غضب ہوا کہ کرفیو کھلا تو لیڈروں کے ساتھ ساتھ محنت مزدوری کرنے والے بھی گھروں سے نکل پڑے۔ کہاں تک

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ کچھ کمائیں گے تو پیٹ کا دوزخ بھریں گے۔ کاریگر
کا مزاج ہمیشہ سے یہ رہا کہ جو کمایا اس سے زیادہ کھا لیا، اب جو گھر قید خانے بنے
اور باہر کا آنا جانا بند ہوا تو روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ شریفوں کو ہاتھ پھیلانے
پڑے۔ جب کہیں کھانا بٹتا تو ایسی ہاہاکار مچتی کہ دیکھے سے وحشت ہوتی تھی۔ پیٹ
کم بخت سب کچھ کراتا ہے۔ غریب عورتیں تک برقعوں میں منہ چھپائے، برتن لئے
اپنی باری کے انتظار میں خاموش کھڑی رہتیں مگر وہاں یہ عالم تھا کہ جو زبردست
تھے وہ آگے بڑھ کے لے لے اور کمزور ناتواں بیچارے فقط دھکے کھا کے واپس
چلے جاتے تھے۔ ایک جھلی والا غریب اپنی سدھ باندھے کہیں چلا جاتا تھا۔ غالباً
اس لئے نکلا تھا کہ مل گئی تو روزی ورنہ روزہ تو ہے ہی۔ چوراہے پر سپاہیوں
سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ انھوں نے جھلی چھین آگ میں جھونک دی۔ وہ کچھ بولا تو دھمکیاں
دینے لگے۔ آتے جاتوں نے اسے چپ کر دیا اور خون کا سا گھونٹ پی کے رہ گئے۔ چاوڑی
کے نکڑ پر ایک ہوٹل میں انہیں دنوں آگ لگ گئی۔ لگی یا لگائی گئی۔ ہوٹل تو
دنوں سے بند تھا اس میں آگ کا کیا کام۔ روئی والوں کی دکانیں جل کر ختم ہوئیں۔
دکانوں کے مالک ان کا آخری دیدار تک نہ کر سکے۔ شہر میں کرفیو بدستور قائم تھا
البتہ اس کرفیو میں تالے بھی ٹوٹے، چوریاں بھی ہوئیں۔ سب خاموشی سے دیکھتے
رہے۔ دم نہ مارا، شکر گزار رہے۔ ظالم مارتے اور رونے نہ دیتے۔

عہد وسطیٰ میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی ملک فتح کیا جاتا تو اس ملک کے
بادشاہ کا خزانہ، املاک، محل اور عبادت گاہ سب پر فاتح کا قبضہ ہو جاتا
تھا۔ اسی بنا پر سلطان قطب الدین ایبک پرتھوی راج کے مندر پر قابض ہوا

تھا۔ اور جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب فتح کیا تو لاہور کی شاہی مسجد بھی
ان کے تصرف میں آگئی تھی۔ دلّی کی جامع مسجد انگریزی اقتدار کے بعد انگریزوں کے
قبضے میں آئی اور پھر ہزار دقتوں کے بعد واگذار ہوئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے
جب دنیا آج کی طرح مہذب اور شائستہ نہیں ہوئی تھی۔ اب نہ تو اس طرح کی جنگیں
ہوتی ہیں اور نہ فتوحات، محل، حرم اور شاہی عبادت گاہوں کا بھی کوئی سوال
نہیں، مگر پچھلے دنوں جو لپا ڈگی پولیس اور شہر والوں میں ہوئی تھی اور دلّی کے من
چلے جو پہنچے پولیس اور حاکمانِ وقت سے کیا کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اربابِ
اقتدار اپنے تیر تفنگ اور فوج فرا کے ایک روز فیصلہ کن جنگ کی ٹھان، دلّی پر چڑھ
آئے۔ دکاندار جو مسجد کے نیچے دکانیں لگائے بیٹھے تھے سب ہٹا دیے گئے۔ تہہ بازاری
ختم ہوئی۔ چلیے اس پر ہی خیر گذرتی۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ رنڈی اور حاکم کا سامنا
اچھا نہیں، نوبت یہاں تک پہنچی کہ جھنجھلاہٹ مسجد پر اترنے لگی۔ پشتے کے نیچے دلّی
والوں کی دکانیں ڈھانے کے لئے بڑے بڑے جرثقیل بلائے گئے اور ان کی یورش
سے اینٹ اور پتھر دلّی کے گالوں کی طرح بکھرنے لگے۔ مسجد کی بنیادیں ننگی ہوئیں
تو انہوں کو ہوش آیا۔ اپنے کئے پر کھسیانے ہوئے اور جلدی جلدی گارا تھوپنے
لگے، تاکہ ان کے عیب پر پردہ پڑ جائے۔ واہٹ کو ستی ایک دیوار کھڑی کر دی۔
مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ کے ماہرین اور دلّی کے دردمند، کیا
ہندو کیا مسلمان، اونچے اونچے میناروں کے نیچے کھڑے حسرت سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔
چھوٹے مینار اور گنبد چاہے ان کے سر پر آپڑتے، مگر اس وقت انھیں اپنی جانوں
کا ہوش نہیں تھا اور توڑ پھوڑ کرنے والے کم بخت ایسا پتھر کا کلیجہ لے کر آئے تھے،

کیتے سے دل اُن کے بھرے پڑے تھے کہ انھیں یہ کبھی خیال نہ آیا کہ ایسی اچھی عمارت جس کی نظیر ہندوستان تو کیا دُنیا میں مشکل سے ملے گی، ذرا دیر میں اڑا اُدھم کر کے ان پڑی تو کیا ہو گا۔ وہ تو یہ کہو کہ جن معماروں نے اسے بنایا تھا وہ جانتے اور پاکباز تھے، ایک ایک اینٹ قل ھو اللہ پڑھ کے رکھی تھی، اس لیے مسجد کھڑی رہ گئی، ورنہ ان جوانا مرگ ڈھانے والوں نے تو کوئی کسر ہی نہ چھوڑی تھی اور اب بھی فنِ معماری کے جاننے والے کہتے ہیں کہ جامع مسجد کی عمر آدھی رہ گئی ہے۔

بغداد جب قزاقوں کے ہاتھ لگا اور دہلی کے خلیفہ کو شکست ہو گئی تو ان قزاقوں نے گلی گلی ایسا خون بہایا کہ دجلے کا پانی سرخ ہو گیا تھا۔ اس سے بھی بڑا ظلم جو انھوں نے کیا وہ یہ تھا کہ بغداد کے بڑے بڑے ادارے اور کتب خانے جلا کے راکھ کر دیئے۔ آج وہ ہوتے تو مشرقی دنیا علم و ہنر کسب و کمال کے میدان میں مغرب والوں سے یوں پیچھے نہ رہ جاتی اور دنیا میں جو عزت یورپ والوں کی ہے اس سے زیادہ ہماری ہوتی۔

مسجد کی بے حرمتی کے بعد تو دلی پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ روز ایک نیا زوال آنے لگا۔ آئے دن احکامات جاری کیے جاتے تھے۔ یہ علاقہ خالی کرادو، اس محلے کو نیست و نابود کر دو، دلی والے سنتے اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے، ہر طرف خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ ایک قتالہ، آفت کی پرکالہ، سفید شلجم جیسی رنگت، آنکھوں پہ کو لہو کے بیل کی سی اندھیریاں چڑھائے، شہر والوں پہ غلام قادر روہیلے کی مانند مصیبت بن کر نازل ہوئی۔ مرد تو اس کے تیور دیکھ کر جان گئے کہ

صرافہ ہے شہنشاہ جہاں جائے گی گُل کھلائے گی، مگر عورتیں، بے چاری بھولی بھالی اس کے بہکاوے میں آ گئیں۔ کسی نے آنا فانا برقعہ اُتارا، کوئی ناک چوٹی کٹا خود اس کی صف میں شامل ہو گئی۔ دلّی کے ایک مولوی گھرانے کو ایسا نشانہ بنایا تھا کہ وہاں کے بچے بچّے کو اپنے سیاہ کرتوتوں کی خاطر بازار میں لے آئی تھی۔ مولوی بے چارے تو کب کے مر چکے تھے خدا انھیں جنت نصیب کرے مگر ان کی اولاد اس بد ذات کی ایسی دیوانی ہوئی کہ بھیاں کے آگے پیچھے پھرنے لگی۔ مثل مشہور ہے کہ بھوتوں کے گھر اولیا اور اولیا کے گھر بھوت۔ سارے شہر میں طبلی پٹوائی، تھڑی تھڑی ہوئی مگر اس کا ساتھ نہ چھوٹا۔

اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو مغلوں کی سلطنت کو زوال ہونے لگا۔ اس کے جانشینوں میں ایک بھی اس قابل نہ تھا کہ حکومت کی باگ ڈور سنبھال لیتا۔ سب کے سب عیش تھے۔ تلوار اُٹھانا ہی بھول گئے تھے۔ ہاں جتنا چاہو ناچ رنگ کرا لو۔ ان ہی دنوں جہاندار شاہ بھی تخت پر بیٹھے اور ایک کسبی لال کنور پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ اسے لمبا چوڑا خطاب دے کر اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ اس کے لواحقین بھانڈ بھگتیوں کو بڑے بڑے عہدے دیے گئے اور یہ عالم ہوا کہ دربار میں ہر طرف سازندے نظر آنے لگے۔ سنا ہے ایک دن لال کنور اپنے جیتے کے ساتھ بھرو کے میں بیٹھی تھی۔ سامنے جمنا کا پاٹ تھا۔ ساحل پر کچھ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو اس مال زادی نے اٹھلا کر کہا "ہم نے کشتی ڈوبتے کبھی نہیں دیکھی" بادشاہ نے تالی بجائی، محلی حاضر ہوا تو اسے حکم دیا کہ سامنے جو کشتی جا رہی ہے اسے غرق کر دیا جائے۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ رات گئے جب بادشاہ سلامت

لال کنور کے ساتھ نشہ میں چور قلعہ میں واپس آئے تو گاڑی کے ساتھ وہ بھی اصطبل میں بند کر دیے گئے۔ کافی دیر بعد ڈھنڈیا مچی۔ اصطبل کو کھولا گیا اور اس میں سے بادشاہ برآمد ہوئے۔ دلّی شہران دنوں ایک تماشا گاہ بن گیا تھا۔ ٹھٹھ کے ٹھٹھ بازاروں میں کھڑے بادشاہ اور لال کنور کی چوما چاٹی دیکھا کرتے تھے۔

محمد شاہ رنگیلے کی والدہ قدسیہ بیگم کو اپنے بچّے کے بادشاہ ہونے کا بڑا ارمان تھا۔ مگر من چاہے منڈیا ہلائے بادشاہت کے نام پر تر بھر موتی تھیں اور رفر باقی تھیں۔ "روشن اختر کو تختِ طاؤس کی ہوا بھی نہ لگائے، چاہے گھاس کھود کر اپنا پیٹ بھر لے، مگر سلطنت کے پیچھے اس کے دشمنوں کا بال بھی بیکا نہ ہو۔ جہاں روشن اختر کی دائی بندی نے ہاتھ دھوئے وہاں لال قلعہ اور ہندوستان کے تخت و تاج کو سات دفعہ قربان کر دوں" ادھر سلطان جی کے صاحبزادوں کو کہلا بھیجا کہ درگاہ کو نتانہ کیا جائے میں نورات کروں گی۔ ڈیرے تنبو درگاہ کے باہر بھی لگوائے گئے اور درگاہ کے صحن میں بھی مناسب جگہ چھوٹا سا خیمہ کھڑا کیا گیا تاکہ آرام دے۔ پہلی رات آئی بیگم نہا دھو روشن اختر کو جن کی عمر چار برس سے کچھ کم تھی، اپنی گود میں لے کر حضرت امیر خسرو کی راوٹی کو پیٹھ دے کر سہ دری کے سامنے عین حضرت کی چوکھٹ کے نیچے مودب بیٹھ گئیں۔ درگاہ کے سامنے اندر، عنبریں شمع اور کافور کی بتیاں جل رہی تھیں۔ خوشبو اڑ رہی تھی مگر درگاہ میں سوائے ان دو ماں بیٹوں کے تیسرا کوئی نہ تھا۔ اگرچہ آستانے کے چاروں طرف کئی سو سپاہیوں کا پہرہ تھا، مگر بیگم کا کلیجہ ڈر کے مارے بلّیوں اچھل رہا تھا

اور اس تصوّر سے جان گھلی جاتی تھی کہ جہاں آرا بیگم اپنے مرقد سے کفن پہنے نکل میرے سامنے آکھڑی ہوں گی۔ آخر حضرت محبوب پاک نے مدد کی اور یہ وہم دل سے مٹ گیا۔ بیگم مقصد کے دھیان میں ڈوب گئیں۔ آن کی آن میں صبح ہو گئی اور یہ نماز پڑھ، بچے کو گود میں اُٹھا اپنی آرام گاہ میں چلی گئیں۔ اس طرح آٹھ راتیں خیر سے کٹیں۔ نویں رات کو روشن اختر اپنی ماں کی گود میں اوندھے پڑے اپنا سر محبوب الٰہی کی دہلیز پر رکھے سو رہے تھے جو یکایک چونکے اور کہنے لگے اماں حضرت میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ بیگم بولیں جان من قربانت شوم کیا دیکھا۔ روشن اختر نے کہا، میں نے دیکھا کہ محبوب الٰہی کی دہلیز پر جہاں میرا سر ٹکا تھا ایک تل پڑا ہے، وہ تل میں نے زبان سے اُٹھا کر کھا لیا۔ بڑا مزیدار تل تھا۔ بس میری آنکھ کھل گئی۔ قدسیہ بیگم نے کہا عمر دراز ہو، مبارک ہو، سلامت، ہندوستان کی تل بھر سلطنت جو بچ گئی ہے وہ حضرت نے تمھیں بخشدی۔ انشاءاللہ تم بادشاہ ہو کر رہو گے۔ خواب خوب پورا ہوا۔ دنیا جانتی ہے کہ روشن اختر بندی خانے سے نکالے گئے اور بادشاہ بنائے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ روشن اختر محمد شاہ رنگیلے حضرت محبوب الٰہی کے ساتھ خاص عقیدت رکھتے تھے مرنے کے بعد بھی حضور کے قدموں میں رکھے گئے۔

محمد شاہ کے زمانے میں دلّی پر نادر شاہ کا حملہ ہوا تو پیغام رساں انھیں پل پل کی خبر پہنچاتے رہے اور وہ شعر پڑھا کیا کیے ہنوز دلّی دور است کا نعرہ لگا کر اطمینان سے بیٹھ جاتے تھے۔ آخر گزرتے بادشاہ دلّی تک آن پہنچے اور لال قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ہیرے، موتی، لال جواہر، سونا چاندی جو کچھ خزانے میں

تھا سب لُوٹ کر لے گئے۔ تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرا بھی ان کی نذر ہوا، تب کہیں رنگیلے کی جان بچی۔ چلتے وقت اس کی فوج نے دلّی والوں پر تلوار کی ایسی باڑھ ماری کہ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ آخر داتا وزیر نے جا کر چاندنی چوک میں سنہری مسجد کے نیچے تلوار لئے بیٹھے نادر شاہ کے حضور یہ شعر پڑھا:

نماند کس کہ بہ تیغِ نگاہِ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی مرکسے و باز کشی

نادر شاہ یہ سُن کر خجل ہوا اور تب اس کے حکم سے دلی والوں کا قتلِ عام روکا گیا۔

محمد شاہ رنگیلے ایک دن اپنے احباب کے ساتھ محفلِ نا و نوش برپا کئے بیٹھے تھے۔ جھروکوں سے اُدھر جمنا بہہ رہی تھی مگر اب اس کے پاٹ میں کمی آگئی تھی اور پانی قلعہ کی دیواروں سے دُور ہٹ گیا تھا۔ بادشاہ نے سوال کیا آخر یہ جمنا قلعہ سے دُور کیوں ہوتی جا رہی ہے۔ کسی اللہ کے بندے نے کہہ دیا کہ حضور قلعہ میں گُناہ زیادہ ہو رہے ہیں اس لئے پانی دُور بھاگ رہا ہے۔ بادشاہ نے ہنس کر جواب دیا اچھا تو اب ہم جمنا کے اس طرف جا کر گُناہ کیا کریں گے تاکہ جمنا پھر قلعے سے آن ملے۔

آگے ملک روم کا ایک بادشاہ تھا کہ فرعون کی سی رعونت اور چنگیز کی سی شقاوت اس کی ذات میں تھی۔ نام اس کا بدبخت اور شہر قسطنطنیہ اس کا پایہ تخت تھا۔ اس کے وقت میں رعیت برباد، خزانے خالی، معیشتیں وافر، سپاہ ناہنجار بدباطن، حکام رذیل اور غریب غربا پریشان، مفلوک الحالی ناآسودہ، ایسے گذران

کرتے تھے کہ ہر ایک کی زندگی موت سے بدتر ہو گئی تھی۔ اس کے عہد حکومت میں وہ افراتفری مچی کہ ایک لشکر کثیر رعیت کی جان کا درپے ہو گیا۔ سارے شہر میں آگ لگ گئی۔ ہر طرف سے چیخوں اور ہائے وبلا کی صدائیں آتی تھیں، مگر خدا نے اس نامراد بادشاہ کو ایسی بے غیرتی کی ڈھال عطا کی تھی کہ وہ اس ہنگامے سے بے خبر چین کی بنسی بجاتا رہا۔ چور، چکار، ڈاکو، لٹیرے اٹھائی گیرے اور صبح خیزیے جتنے تھے سب اس کے دامن عاطفت میں سمٹ آئے اور شہر والوں کا جینا حرام کر دیا۔ بادشاہ اور اس کے حوالی موالی پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آپ اپنی خوشیوں میں مگن، آنند کے ساتھ اس طرح عیش کرتے رہے کہ دن عید اور رات شب برات تھی۔

کہتے ہیں جب ترکمان گیٹ پہ تیلیوں کی بستی اجاڑی گئی تو ایک لشکر فوج کا ناحد نظر ٹڈی دل کی طرح پھیل گیا۔ ہتھیار طرح طرح کے ان سپاہیوں کے جسموں پہ سجے تھے۔ پانی پت کا میدان آنکھوں میں پھر گیا۔ کسی بھلے آدمی نے کہا میاں چڑیا کا گھونسلا اکھڑتا تو وہ ننھی سی جان آدمی پہ حملہ کرتی ہے یہ کہاں کا انصاف ہے کہ توپ کی فوج پرا باندھے نہتے غریبوں کو اجاڑنے آ گئی۔ انہوں نے کہنے والے کو تہہ تیغ کر دیا۔ اللہ اللہ ان کے تیور۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ برسوں کی لگی بجھانے آئے ہیں۔ کوئی بھلا مانس ڈھونڈے ڈھونڈے نہ ملتا۔ فوج کے جرنیلوں تک بھی جا پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہ بھڑوے سیاہ کار رنڈیوں کو بغل میں دبائے شراب خانہ خراب سے جی بہلا رہے ہیں۔ اس نیک بخت نے کہا کہ خلق خدا تمہارے دم کو دعائیں دیتی ہے اور تم یہاں بیٹھے اپنی ماؤں سے منہ کالا کرتے ہو، تف ہے تمہاری ذات پہ، اور

تمہارے ہوتے سوتوں پر، اگر ذرّہ برابر بھی غیرت تمھیں چھو گئی ہوتی تو ہرگز ایسا کام نہ کرتے جس کے عوض ہزاروں بندگانِ خدا اپنے گھروں سے بے گھر ہوں گے آخر یہ کہاں کی انسانیت ہے اور کون سے مذہب میں جائز ہے۔ یہ دونوں اس مردِ خدا کی زبان سے یہ کلمہ سن کر آگ بگولا ہو گئے۔ دیوانگی کے عالم میں اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ سینہ اس کا ابھی ہمارے روبرو بندوق کی گولی سے چھید دیا جائے۔ پھر کیا تھا، ان نامرادوں نے اس نہتے پر وار کر، کام اس کا وہیں تمام کر دیا۔

یا فغرا! اس روز دھوپ میں پردہ نشین عورتیں اپنے اپنے گھروں سے نکل کر شاہ ترکمان بیابانی کی درگاہ کے پاس جمع ہو گئی تھیں اور اپنے خدا سے دعا کر رہی تھیں کہ اے پروردگار ان بزرگوں کے وسیلے سے ہماری کشتی پار لگا۔ ہم وکیا گھروں سے نکل آخر رواں دواں کدھر جائیں گے اور ہمارا ٹھور ٹھکانا کہاں ہوگا۔ ان ظالموں سے تو ہمارا جی نہیں چاہتا کہ کچھ گزارش کریں، بس اب تو ہی ہمارا رکھوالا ہے۔ کوئی کہتی اگر یہ بلا ٹلی تو معصوم بچوں کو صحنک کھلاؤں گی، کسی نے کھڑے کھڑے مشکل کشا کا دونا مانا۔ کوئی مدینے کی طرف ہاتھ اٹھائے فریاد کرتی تھی کہ اے خدا کے حبیب ہماری بجائیں آپ کے نامِ نامی پہ صدقے، ہماری مشکل آسان کیجیے۔ کسی کے سر پہ چادر نہیں تو کوئی ننگے پیر فرش پہ کھڑی اپنے آپ کو پیٹتی تھی۔ پانی تک وہاں میسر نہیں تھا اور چیخنے والیوں کے ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی تھیں۔ چاروں طرف پہرے کے پہرے ہتھیار بند فوجیوں کے تھے۔ ارباب اقتدار بھی ایک طرف بہرے کھڑے تھے۔ ناگاہ انھوں نے حکم دیا کہ شنوائی کسی کی ہمارے روبرو نہیں ہوسکے گی اور لوگوں کو چاہیے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ کر سامان وہاں سے نکالیں کہ شام تک دیکھتے اور نہیں یہ کل آبادی شام تک جنگل

بیابان کی طرح ویران کرنی ہے۔ آہنی مشینوں سے اس بستی کے مکانوں کی نیو
تک نکال پھینکیں گے۔ اس وقت ایک صاحبِ حوصلہ، اللہ کی بندی، عورت
ذات، ہیلہ مار کے آگے بڑھی اور للکار کے کہا۔ بڑھ چلو! ہم عورتوں کے نہیں کہ
ہتھیار نام کیل کانٹا بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔ تمہاری ان گیدڑ بھبکیوں میں آنا
ممکن نہیں.... مرنا برحق ہے لو اب اپنے دل کی نکال لو۔ مردوں سے تو تم کیا
نمٹو گے، اگر ہمارے ساتھ کسر کرو تو تمہاری جنتیوں پر طلاق ہے۔ یہ بندوقیں اور
سنگینیں جو تم ہم پر تانے کھڑے ہو بیشک تم ہیجڑوں کے لیے بڑی چیز ہوں گی۔ ہمارے
آگے ہیچ ہیں۔ تمہاری اس جمعیت کو ہم پیر کی جوتی بھی نہیں سمجھتے۔ حکام بالا دست
کو یہ کلمات سننا بھلا کب گوارا تھے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ بندوقیں داغ دیں۔ بچے ہوا میں
اڑنے لگے، بچے اور بوڑھے جو کسی لائق نہ تھے، ان بے چاروں کا خون ہوا، اور
جوانوں نے خواہ عورتیں ہوں یا مرد ایسا ڈٹ کر مقابلہ کیا کہ دشمنوں کے دانت کھٹے
کر دیے۔ چھ گھنٹے رن کے میدان کا نقشہ رہا۔ ادھر ادھا، بوتل، اینٹ پتھر، ادھر ایسے
ایسے نئے ہتھیار کہ جن کا نام لیے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ آخر نامراد ان ہتھیاروں
کے بل پر شہر کی کچھار میں گھس آئے۔ کمزوروں کو دبا کر رگڑے اور شہر کو گرانا شروع کر دیا۔
بس عزیزہ، اس وقت ایسی بھگدڑ مچی، اور قیامت کا منظر پیدا ہوا کہ اسے سننا... کی
کی طاقت مجھ جاں نکاہ میں نہیں ہے۔ عورتیں اپنی گود کے بچوں کو گھپ اندھیرے میں ڈھونڈتی
پھرتی تھیں، بوڑھے، اپاہج، اندھے دھندے سب آسیبیوں کی طرح دیواروں سے
سر ٹکراتے تھے۔ سامان جگہ جگہ اینٹ اور مٹی کے ڈھیر تلے دبا پڑا تھا۔ دنیا کی خبر تھی
مگر کسی کو اس کی فکر نہیں تھی، جانوں کی خیر مناتے تھے۔ کسی کے بچے ملبے میں دبا

گئے، کسی کی بڑھیا ماں کا پتہ نہیں، کسی کا بوڑھا باپ لہولہان ہے تو کسی کا بھائی غائب۔ ایک طرف یہ مارا کاٹی اور دوسری طرف یہ ظلم کہ سپاہی جوانوں کو گرفتار کرکے بندی خانے لے گئے۔ زخمی جو اسپتال پہنچے تو وہاں ان کی بری درگت بنائی گئی۔ غرض یہ کہ سارا علاقہ دیکھتے دیکھتے خالی ہو گیا۔ رات ہوئی تو وہاں اُلّو بولنے لگے۔ ایسا منظر اس فقیر نے اپنی آنکھوں سے نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ خدا کرے کہ اسے آئندہ دیکھنا نصیب ہو۔ بیان اس کا کرتا ہوں تو کلیجہ شق ہوا جاتا ہے اور آنسو آنکھوں سے رواں ہو کر رکنے کا نام نہیں لیتے۔

دلّی کے قریب ایک آبادی شاہی زمانے میں روہیلوں کی تھی۔ وہاں کا ایک امرد غلام قادر نام کا تھا۔ اس کا باپ قلعے میں ملازم تھا۔ شاہ عالم ثانی کی حکومت تھی۔ ان دنوں دلّی کے رؤسا میں امرد پرستی کا بڑا ذوق تھا ۔۔۔ لو صاحب اس امرد پر بادشاہ کی نظر پڑی تو فریفتہ ہو گئے۔ گاڑی میں سوار ہو کر بہ نفسِ نفیس اس کی جائے اقامت تک گئے اور داد بھری نظروں سے دیر تک دیکھا کیے، پھر اس کی نس کٹوا اپنی معشوقی میں لے لیا۔ خدا کا کرنا یوں ہوا کہ وہ ایک دن وہاں سے نکل بھاگا اور پھر کچھ دن بعد دلّی پر اللہ کا عذاب بن کر نازل ہوا۔ اسی نے شاہ عالم کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروائیں۔ اسے اندھا کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا اور اس کے حرم کو برہنہ کر کے اپنے روبرو ناچنے پر مجبور کیا۔ ان گنت غیرت والیوں نے تیچھے جمنا کی طرف کود کر جانیں دے دیں۔ ایک دن وہ تلوار رکھ منھ لپیٹ سر نہوڑا کے لیٹ گیا۔ مغل شہزادوں نے جانا کہ سو رہا ہے اور عافیت کے ساتھ ادھر ادھر پھرتے رہے۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ بیٹھا اور شہزادوں سے سوال کیا کہ اے تیموری اولادو، بتاؤ میں کیا

کرتا تھا۔ وہ بولے حضور آرام فرماتے تھے۔ اس پر اس نے شہزادوں کے تئیں ننگی گالیاں دیں اور برہم ہو کر کہا، کیا میں نرا احمق اور گاؤدی ہوں کہ دشمنوں کے نرغے میں آرام کرنے لگوں، میں تو تیموری شہزادوں کی غیرت کا امتحان لیتا تھا، معلوم ہوا کہ تم سب اپنی مردانگی کھو بیٹھے ہو۔ اس کے بعد اس نے ایک ایک کو رسوا کر کے شہر کے بیچ پھرایا اور اپنے سپاہیوں کے بھاری جوتوں سے ان کی پسلیاں تڑوا ڈالیں۔

شہر میں جب سے وہ قصہ جس کی بابت میں نے ابھی بتایا تھا کہ اس کے سبز قدموں نے ہزاروں گھر گھاٹ مولویوں اور نام نہاد دینداروں کے تئیں شیخ سناں بنایا تھا۔ سور کے بچے ان کے کندھوں پر رکھوائے، اور اس ازار کھلی کے ننگ مادروں نے تاوے کاٹنے شروع کئے تھے اسی دم شہر والوں کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ آخر ایک دن جب لوگوں نے ابھی اپنی بے دخلی کے ماتم سے نجات نہیں پائی تھی ایک اور نئی مصیبت ان کی جانوں پر ٹوٹ پڑی۔ نواب دوجانے کے پھاٹک میں زمین دوز مقتل بنایا گیا۔ پہلے نئی شہر کے لوگ پکڑے گئے۔ چاروں طرف کارندے سرکار کے شکار ڈھونڈتے پھرتے تھے جو ہاتھ آتا اسے گھیر گھار اندر لے جاتے تھے، اور جاتے ہی سونے کی چڑیا پھر سے اُڑا دی جاتی تھی۔ جب دلی میں مرد نام کو چڑیا کا بچہ نہیں رہا تو آس پڑوس کے علاقوں پر دھاوا بولا گیا۔ میرٹھ، مظفر نگر، ہاپوڑ، سکندر آباد اور امروہے سے بھیڑیں بھر بھر کے لائی جاتیں، اور دیکھنے والے ان کے انجام پر نظر کر کے بیری کی مانند لرزتے تھے۔ ان کی بے بسی دیکھ انھیں اپنی موت یاد آتی تھی۔ رات دن لوگ علامت پر ہاتھ دھرے جو کسی

کیا کرتے مبادا ایسا ہو کہ سرکاری ہرکارے آئیں اور ان کی مشکیں کس لیں۔ مسجد کے ملّا یا خدا جانے داڑھی والے کوئی اور لوگ تھے جو بے غیرتی سے اس سفاکی کے حق میں باتیں کیا کرتے اور اس فعل کو بے بنیاد شرعی اسناد کی روشنی میں سراہتے رہتے تھے۔ ایک روز دلّی کی دیواروں پر جہازی اشتہار بھی چسپاں کیا گیا جسے دڑوں نیچے بردوں کل مسائل یوں کھول کھول کر بیان کئے تھے کہ بچّے بچّے نے زندگی کے سربستہ رازوں کو جان لیا اور اس کے باریک نکتوں پر بزرگوں سے بحثیں کیں۔ مدتوں لوگ اس کی عریانی کے چٹخارے لیتے رہے۔ مسخرے مولویوں نے ایسی ایسی قلابازیاں کھائیں کہ عام لوگ بے چارے حیران رہ گئے۔ کس کی مانیں اور کس کی نہ مانیں۔ بڑا افراتفری کا عالم تھا۔

سُنا ہے بغداد میں کسی خلیفہ کی نظر اپنی باندی پہ جا پڑی۔ دم میں ہوش دیوانے ہو گئے۔ عندیہ لینے پر معلوم ہوا کہ باندی ان کے باپ کے حرم میں رہ چکی ہے۔ بہت چاہا کہ دل کو سمجھا لیں، مگر نفس امارہ کے آگے ایک نہ چلی۔ خلافِ شرع لقمہ توڑنے کی مجال نہیں تھی۔ جھٹ علمار سوء کو بلا کے حکم دیا کہ راستہ نفس کی آسودگی کا جو نکال کے لائے گا، خلعتِ فاخرہ اور انعام و اکرام بے بہا دربار سے پائے گا۔ آخر ایک شخص کہ اپنے تئیں عالم بے بدل کہتا تھا، حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اے امیرالمومنین یہ امر کہ باندی آپ کے والد ماجد کے حرم میں رہ چکی ہے آپ کو خود اس کی زبانی معلوم ہوا ہے نہ کہ آپ کے والد خلد آشیانی نے بتایا تھا۔ پس لونڈی کا قول ضعیف ہے اور ہرگز لائق اعتبار نہیں۔ اس لئے آپ بے پس و پیش اس سے نکاح کیجئے اور دادِ عیش دیجئے۔ خلیفہ نے جو دل کی مراد پائی تو عالم کو جاگیریں دے کر مالا مال کر دیا۔

اے عزیز جانی! دلّی کے بھرے بازار میں ایک روز سرِ شام انبوہِ کثیر کا مجمع تھا۔ ایک شخص کا بیان، سنوں کی صورت بنائے جانب آسمان نگراں تھا۔ لوگوں نے دیکھا کہ اس کے منہ پر ناک نہیں تھی۔ پھبتی بازوں نے نکٹے نکٹے کی آوازیں کسنا شروع کر دیں۔ وہ شخص تحمل سے بولا میں نے ناک اپنی آپ کاٹی ہے کہ میرے اور خدا کے درمیان پردہ بنی ہوئی تھی۔ اب دیکھنے میں کھڑا اپنے رب کا دیدار کرتا ہوں سبحان اللہ و بحمدہ، کیا نور کا عالم ہے۔ کچھ بے وقوف اس کی دیکھا دیکھی آگے بڑھے اور استرا ہے اپنی ناکیں کاٹ دیں۔ اب جو اوپر دیکھتے ہیں تو وہاں کچھ بھی نہیں توبہ توبہ، کیسا دیدارِ خداوندی، مفت میں نکٹے ہو گئے۔ لجاجت سے اس شخص کے قریب گئے جس کی تحریک پر یہ کام کیا تھا اور یوں گویا ہوئے کہ یا ہادی ہمیں تو خدا دکھائی دیتا نہیں، تمھیں کہو اب کون سا پردہ ہے۔ اس نے جھک کر ان کے کان میں کہا بس اب یونہی کہتے رہو کہ خدا کا دیدار میسّر آیا، ورنہ لوگ نکٹا کہہ کہہ کے ناک میں دم کر دیں گے۔ چناں چہ سب نے یہی ہانک لگانی شروع کر دی۔

غدر میں سنا ہے کہ ایک فقیر دلّی کے گلی کوچوں میں یہ صدا لگاتے تھے کہ سات دلّی، آٹھ بادلی قلعہ وزیر آباد۔ ان دنوں تو لوگ ان کی بات سمجھ نہیں پائے، مگر اب برسہا برس بعد ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دلّی کے بھرے پُرے محلّوں کو دشمنوں کی نظر کھا گئی۔ اندر پرستھ، تغلق آباد اور کھلوکری کی طرح جہان آباد کے ٹھاٹ بھی مٹنے لگے۔ بڑی بڑی آبادیاں یہاں سے نکال بادلی اور وزیر آباد کی طرف دھکیل دی گئیں۔ یہ ہنگامہ ہنوز جاری ہے انت اس کا خدا جانے کیا ہو گا۔ فقیر کی اپنے رب سے یہ دعا ہے کہ اے معبود میرے عزّت اور جان و مال دوست دشمن سب کے محفوظ رکھیو۔

اور اس بلا کو دلّی والوں پر سے یوں ٹالیو کہ ان کا بال بیکا نہ ہو۔ ہر چند کہ مجھے پیشگوئی کا یارا نہیں۔ اس فن سے مطلق طبیعت میری علاقہ نہیں رکھتی اور ایمان میرے تئیں یہ ہے کہ وہ جو کل ہونے والا ہے سوا خدا کے کوئی نہیں جانتا مگر اپنے قیاس اور دنیا کے ڈھال کو دیکھ کر کہتا ہوں، کیا عجب یہ سچ ہو اور کلمہ میری زبان سے نکلا اللہ اپنی حرمت سے پورا کرے۔ ظالموں کا منہ کالا ہو، حق کا بول بالا ہو کہ ایسا ہی اس زمین کے بیچ سدا سے ہوتا آیا ہے۔

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

اتنا کہہ کے وہ درویش یارِ بیش زار و قطار رونے لگا۔ رات اپنی انتہا کو پہنچ کے ڈھلنے پر مائل تھی، اس وقت سب نے کھلی آنکھ سے دیکھا کہ دور افق کے اس پار روشنی کی ایک کرن سیاہی کے دبیز پردے تلے صبح ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔

۱۵ دسمبر ۱۹۷۶ء

دِلّی کی پتنگ بازی

دلّی کے گلی کوچوں اور تعمیرات سے واقفیت رکھنے والے یہ بات خوب جانتے ہوں گے کہ یہاں کی گلیاں تنگ اور مکانات یک منزلہ ہوتے تھے۔ لوگ شام کا سہانا وقت عام طور سے چھتوں پہ گذارتے تھے اور اس طرح کچھ ان کا رشتہ زمین کے ساتھ ساتھ آسمان سے بھی استوار رہتا تھا۔ کبوتر بازی اور پتنگ بازی بنیادی طور پر اس آسمانی رشتہ کی کوکھ سے پیدا ہونے والے فن ہیں۔ دلّی والوں کی ایک خصوصیت ایسی تھی جو انھیں تمام انسانی برادری میں امتیاز اور انفرادیت بخشتی تھی اور وہ خصوصیت یہ تھی کہ دلّی میں ہر شوق اور فن کو کمال کی منزل تک لایا جاتا تھا۔ دلّی میں اب پہلے جیسے باکمال تو رہے نہیں۔ دلّی نے کئی بار خونی غسل لیا ہے، البتّہ شاہجہانی دیگ کی کھرچن دلی میں تلاش کیجئے تو آج بھی جہاں تہاں مل جائے گی۔ دلّی باکمالوں

کا شہر تھا آج بھی کچھ باکمال پُرانے کھنڈرات کی طرح دلّی کے کونے کھدروں میں مل جاتے ہیں۔ انھیں دیکھ کے دلّی کی پرانی عظمت، ہیبت و جلال کی یاد تازہ کر لیجئے جو آج ہے کل نہیں رہے گا۔ زمانہ مائل بہ زوال ہے۔ دنیا بدل رہی ہے۔ قدریں بدل رہی ہیں۔ پُرانے کمال اب عیوب گردانے جاتے ہیں اور پُرانے باکمال بیچارے سِسک سِسک کر دم توڑ رہے ہیں۔ ؎

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تُو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانوں کی خاک

غالبؔ نے عیش کی تعریف یوں کی تھی کہ جس شخص کو جس چیز کا شغف ہو اور وہ اسے بلا کسی روک ٹوک پورا کرے تو سمجھئے کہ وہ عیش کر رہا ہے۔

دلّی والوں نے مدتوں عیش کیا ہے۔ یہاں نہ جاگیریں تھیں نہ لمبے چوڑے کارخانے نہ کوئی بڑی تجارتی منڈی۔ صرف کاریگر تھے۔ دو ہاتھ تھے، اور ان ہاتھوں کی کمائی لُٹانے والا دل تھا۔ دلّی والے اس لئے نہیں کماتے تھے کہ وہ بڑے رئیس بنیں گے یا قارون کی طرح دولت کے انبار لگائیں گے۔ انھوں نے چھکڑوں بھر روپیہ کمایا اور اس کا لطف اُٹھا خالی ہاتھ قبر میں جا سوئے۔ نہ باقی بچے نہ گنتا کھائے۔ جس مکان میں عمر بھر رہے اللہ کے فضل سے وہ بھی مرتے دم تک کرائے کا رہا اور مرے تو تکیہ کے نیچے سے ادھی پاؤلی کے علاوہ کچھ نہ نکلا۔ جو کمایا وہ جی کھول کے اُڑایا۔ لنگوٹی میں پھاگ کھیلے۔ اولاد کو اپنے فن میں طاق کیا۔ کاریگری کے نکتے سکھائے اور ٹانگ پھیلا کے مرگئے۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔ ؎

اس خرابے میں نہ کر کچھ فکر تو تعمیر کی

دلّی جب بادشاہ بخیر آباد تھی تو یہاں روز ایک میلہ رہتا تھا۔ دلّی والے بڑے میلانی تھے۔ میلوں میں جاتے اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی پھونکتے اور خوشی جو زندگی کی سب سے بڑی دولت ہے حاصل کر کے آجاتے تھے۔ دلّی میں شرفا کی پہچان یہ بھی کہ ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی شوق لگا ہوتا تھا جو کسی بازی میں نہیں وہ کیا شریف وہ تو بھورڑو ہوا۔ تجھے نہ بھناؤں تیرا بھیا اور بندھاؤں۔ سچ پوچھئے تو نتافوے کا پھیر ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ جس نے یہ مقصد بنا لیا کہ برے بھلے طریقوں سے دولت کمائی اور خرچ کرنا نہیں جانا وہ انسانوں کا لہو پیتا ہے۔ دلی والوں نے خواہ لنگوٹی ہی میں پھاگ کھیلا برے بھلے دن ہنس ہنس کے گذارے۔ کل کی فکر نہ کی اور بغیر اثاثہ چھوڑے مر گئے لیکن زندگی گذارنے کا جو طریقہ بتا گئے وہ اپنی جگہ خوب ہے۔ اس میں ہاؤ ہاؤ نہیں۔ چور بازاری اور بے ایمانی نہیں۔ اطمینان ہے آسائش ہے۔ میٹھی نیند ہے، سکھ چین ہے غرض وہ سب کچھ ہے جس کے لئے آج کا آدمی بے چین دکھائی دیتا ہے۔

لیجئے بات پتنگ بازی سے نکلی تھی اور دلّی کی نتاخوانی تک پہنچ کر رک گئی۔ اسے تو یہیں چھوڑیئے پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ دلّی والے داستان گو ہوتے ہیں۔ بات میں بات نکالتے ہیں۔ خیر اب نہ دلّی ہے نہ دلّی والے۔ آپ پتنگ بازی کی بات سنیئے۔

نادر والی پر دلّی کے پتنگ باز پتنگ بازی کے مقابلے کے لئے جاتے تھے۔ دریا پار تک بڑھا کے پیچ لڑتے اور پتنگ کٹنے پر ہاتھ سے ڈور توڑ دی جاتی تھی بچانے دیکھنے والے بھی تو آخر کچھ دیکھنے کی داد پائیں۔ پھر یہ کچھ اچھا شگون بھی نہیں سمجھا

جاتا تھا کہ ایک بار کٹی ہوئی ڈور سے دوسرا پینچ لڑایا جائے۔ بڑی بڑی خوشرنگ پتنگیں اور کنکّلیں اتنی لمبی اور اونچی بڑھائی جاتیں کہ فرشتے عبادت چھوڑ اس تماشے میں لگ جاتے تھے۔ دریا کی ریت پر دُور تک پٹیا چھوٹتا مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ ہاتھ بڑھا اس پر قبضہ کرتا ڈور لوٹنے کے بھی کچھ اصول تھے آج کی سی بے اصولی زندگی نہ تھی۔ بس یہی امنے داری تھی۔ دلّی والے عام طور سے ڈھیل کے پینچ لڑاتے تھے۔ ڈور پہ ڈور چھوڑتے جاتے اور انگلیوں کی حرکت سے پتنگ کو وہ بل کھلاتے کہ دیکھنے والے عش عش پکارتے تھے۔ پھر جہاں کسی سے چوک ہوئی اور اس کی پتنگ گئی۔ کھنچائی کے پینچ لڑانا دلّی والوں کے نزدیک اناڑی کا کام تھا۔ کوئی اگر کھینچنے کی کوشش کرتا اور نیچے سے بیٹھتا تو ہلکے سے جھونک دیتے اور اوپر سے آتا تو گڈی کو شدہ کھڑا کر دیتے وہ بے چارہ خود اپنے زور میں ایسا جاتا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے۔

پتنگ بازی یوں تو تمام سال ہی ہوتی تھی مگر خاص طور سے اس فن کے لئے برسات کا موسم مقرر تھا۔ برسات میں دلّی جیس سے دو چار ہوتی ہے۔ پتنگ بڑھا کر اس مقام تک لانا جہاں اسے ہوا لگے اس موسم میں آسان کام نہیں تماش بین لونڈوں سے دریائی دلائی جاتی جب کہیں جا کر گڈی ہاتھ بھر بلند ہوتی تھی بس پھر ہلکی سی ٹھمکی سے وہ اس طرح آگے بڑھتی جیسے کوئی ماہر فن قاصد قدم ناپتی ہو۔ لکھنؤ کا کتھک معلوم ہوتا۔ خدا خدا کر کے پتنگ ہوا کے دوش پہ سنبھلتی۔ اس پہ ڈھیل کا پینچ جس نے لڑائی ہو وہی جانے۔ گڈی نیچے دھنسی جاتی اور بل پر بل دیئے جاتے کبھی کبھی تو گھنٹوں یہ سلسلہ چلتا۔ کوئی اگر اس پل صراط پر لڑکھڑانے لگتا اور گڈی کو سنبھالنے میں کوتاہی کرتا یا بھول سے ذرا کنے کھینچ لیتا تو اس کا کام تمام ہوتا اور

اس کی گڈی اُفق کے پار بادلوں کے دیس میں اترتی دکھائی دیتی یا کوئی نگاہ باز ڈور بکچ کر اسے سنبھال لیتا تو یوں کھڑی ہو جاتی جیسے ٹھوکر کے بعد اب ذرا رقص میں ٹھہراو لے سستانے لگی ہو۔

صبح سے شام تک پیچ کٹتے تھے۔ کاٹنے والا چڑانے کے لئے بیری پکارتا تھا۔ اب آپ پوچھیں گے یہ بیری کیا ہوتی ہے۔ میاں زبان داں بغیر زبان ہلائے بھی باتیں کر لیتے ہیں۔ سینکڑوں گز کے فاصلے پر یہ تو ممکن نہ تھا کہ کوئی فقرہ کسا جاتا۔ ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشت شہادت کا دائرہ بنا اس دائرہ کو ہونٹوں پہ رکھ کر زبان سے ہلکی سی آواز پیدا کرنے کا نام بیری تھا اور یہ دوسرے فریق کو غیرت دلانے کے لئے کیا جاتا تھا۔ اگر دوسری طرف سے ہار تسلیم کرتے ہوئے پیچ لڑانے کا سلسلہ موقوف ہوتا تو ایک اشارہ تھا جھنجھلائی کے پاس سے ہاتھ نیچے ڈھیلا چھوڑ کر انگلیاں لٹکا دیتے تھے اس کا مطلب وہی نکلتا تھا جو "تھو ہے" کا نکلتا ہے۔ اس طرح چھیڑنے اور چڑانے کا رواج شرفا میں نہیں تھا بلکہ صرف سوقیوں میں ہی ایسا کیا جاتا تھا اور ان دونوں اشاروں کا معنوی مطلب بھی کچھ اچھا نہیں۔ سمجھئے ایک قسم کی گندی گالی ہے۔ مگر گالی کو بھی ہم اپنی سماجی زندگی سے خارج تو نہیں کر سکتے۔ گالی کا اپنا لطف ہوتا ہے۔ جس نے گالیاں دی ہوں گی وہی میری بات کو سمجھ سکتا ہے اور جس بے چارے کے مقدر میں فقط گالیاں کھانا لکھا ہے اس کے نزدیک بیشک گالی ایک ایسا فعل ہے جسے کرنے والے کو گردن زدنی سمجھنا چاہیے۔

پتنگوں کے نام وام تو اب مجھے یاد نہیں رہے۔ اب پتنگ اڑانا تو دور کی بات ہے، پتنگ اُڑتی دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتی۔ خدا اس زمانے کا بھلا کرے اس

نے سب بل نکال دیئے ہیں۔

ہم نام کو دلّی کے شریف ہیں مگر اب ہم کسی بازی میں نہیں۔ کبوتر بازی، پتنگ بازی، تیتر بازی، بٹیر بازی اور سب سے بڑھ کر رنڈی بازی کا فقط نام جانتے ہیں۔ کچھ ان بازیوں کے بارے میں سُنا ہے اور سچ پوچھیئے تو جو سُنا ہے وہ بھی کیا ہے۔ پھر اسے سُنانے کی ہم میں اہلیت نہیں۔ اللہ غریق رحمت کرے شاہد احمد دہلوی ہوتے تو دلّی کی پتنگ بازی پر جم کر بات کرتے۔

بہر حال جو آتا تھا وہ لکھ دیا اسے کافی سمجھیے اور اگر پتنگ بازی کا صحیح لطف اُٹھانا ہو تو کچھ پھونک کر دیکھیئے دریا کو دیکھنے سے پیاس نہیں بجھا کرتی ۔۔۔ زر پھونک تماشا دیکھیئے بلکہ میں تو کہوں گا گھر پھونک تماشا دیکھیئے پھر کچھ لطف آپ کو بھی آئیگا۔

شخصیات
اور
انشائیے

خلیفہ مرگاک

گاؤں گوٹھ اور قصبات میں دودھ والا وہ شخص کہلاتا تھا جو صبح سویرے بالٹی اُٹھائے "دودھ لو" "دودھ لو" کی آواز لگا کر گھر گھر دودھ بانٹتا پھرے، لیکن دلّی کا دودھ والا بھی یہاں کے دوسرے دکانداروں کی طرح بڑی آن والی ایک منفرد حیثیت کا مالک ہوتا تھا۔ صبح کا دودھ تو اس کے چیلے چپاٹے، نوکر چاکر جست کی خوشنما بالٹیوں میں پیتل کی گھنٹیوں سے ناپ کر دکان کے چبوترے پر بیٹھے ہی تقسیم کر دیتے تھے۔ سیر پیچھے پیسے دو پیسے کا منافع ملتا ہوگا۔ بس یہی کافی تھا۔ پتلا پانی جیسا دودھ جو جمنا کے اُس پار سے دودھیے سائیکلوں پہ لاتے تھے وہ یونہی کا یونہی بانٹ دیا جاتا تھا۔ نہ دھوکا نہ دھڑی، اگر دودھ بُرا ہو تو جی بھر کے گائے بھینسوں کو کوسئے۔ دلّی کے دودھ والے نہ ہاتھ گنے نہ پاؤں۔ اِدھر لیا اُدھر دیا۔ ان کی جانے بلا کہ دودھ میں پانی ملا تھا یا پانی میں دودھ۔ دلّی والے صبح

ناشتہ پوڑی اور ترکاری یا حلوے مانڈے سے کرتے تھے۔ غریب غربا ستو پی کر گزارہ کرتے یا جاڑا ہوا تو دن چڑھے بس کھانا کھا لیا۔ دودھ کی کھپت یہاں برائے نام ہی ہوتی تھی۔ کچھ گود کے بچے پیتے اور کچھ دوائی ٹھنڈائی کے لئے منگایا جاتا تھا۔ البتہ شام کو دودھ والوں کی دکانیں دھو دھلا کر چار بجے سے شیشے کی طرح چمکائی جاتی تھیں۔ بڑے سے آہنی کڑھاؤ میں کٹی کی راکھ اور انجورے کی ٹھیکریاں ڈال ایک نوکر اس کے بیچ میں کھڑا ہو جاتا تھا اور گھنٹوں اس طرح کولہا لگاتا تھا جیسے کوئی پھوہڑ گنوار کتھا کلی ناچ رہی ہو۔ پھر جب یہ کڑھاؤ مانجھ مونجھ کر چبوترے کے کنارے پر کھڑا کیا جاتا تو خوب جگر مگر چمکتا تھا۔ بلجیم کی ٹکڑی کی طرح ایسا صاف شفاف آپ چاہیں تو اس میں اپنا منھ دیکھ لیں۔ اس کے بعد بھٹی سلگتی۔ تاؤ دیئے جاتے اور کوئی من ڈیڑھ من دودھ ہلکی آنچ پر اونٹانے کے لئے چڑھا دیا جاتا تھا۔ اس دودھ میں خدا جانے کس چیز کی آمیزش ہوتی تھی کہ رات کا ایک پہر گزرتے گزرتے یہ لئی کی طرح گاڑھا ہو جاتا تھا اور کورے لٹھے کے تھان جیسی ملائی سارے کڑھاؤ پر ڈھکن کی طرح چھا جاتی تھی۔ بیچ میں نظر گذر سے بچنے کے لئے ایک بڑا سا کیکر کا کوئلہ یوں رکھ دیا جاتا تھا جیسے غلافی آنکھوں میں سرمے کی تحریر ہو۔ بعض من چلے حلوائی ورق لگا دیتے یا پسیرا ملائی کی سطح پر ہلکے سے ٹکا دیتے تھے۔ اللہ اللہ اس آب و تاب کی ملائی کہ دیکھنے والے کی رال ٹپکنے لگے اور بے اختیار کھانے کو جی چاہے۔

خلیفہ مکاک دہلی کے دودھ والے تھے اور انھیں دیکھ کر دودھ کی بھرپور غذائیت کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ موٹا آدمی ان دنوں صحت مند سمجھا جاتا تھا اور توند اس بات کی نشانی تھی کہ اللہ رکھے چند ٹکے بھی جیب میں ہیں۔ کھاتا پیتا آدمی ہے۔ مکاک میاں

ہر اعتبار سے بھرے پُرے آدمی تھے ناف پہ پرکار رکھ کے دائرہ کھینچو تو سارا جسم دائرے میں سما جائے گا۔ دل کی ڈبیا کو اس ویل مچھلی کی رگ رگ میں خون پہنچانے کے لئے کتنا بار اُٹھانا پڑتا ہوگا۔ اس کا اندازہ تو آج کل والے ہی کر سکتے ہیں جنھیں اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے دل کے دورے پڑا کرتے ہیں۔ ان دنوں آدمی اللہ کے حکم سے مرتا تھا اور موت کا خوف تو ہم جیسے تھڑ دلے ہی کیا کرتے تھے جس کی آئی وہ مر گیا۔ اللہ اللہ خیر صلا، چنانچہ اسی طرح ایک دن بھائی مکاک بھی مر گئے۔ پھول فاتحہ ہوئیں، جمعراتیں پڑھوائی گئیں اور یاد کرنے والے آج بھی ان کا نام لیکے انھیں یاد کرتے ہیں۔ مگر وہ بیچارے اب کہاں؟ ان جیسے لوگوں کی تو پوری کھیپ ہی اس دنیا سے اٹھ گئی۔

مکاک کو سردی بہت کم لگتی تھی۔ بھٹی کے آگے ہلکی ہلکی سینک تو ہوتی ہی تھی وہ خوب کڑکڑاتے جاڑے میں بھی ہلکی سی چادر ٹانگوں پر ڈالے اطمینان سے بیٹھے رہتے اوپر کا دھڑ بے حس ہو گیا تھا اس پر جاڑے میں کرتا یا کرتے اور قمیض کا ملاپ یہ ہوتا تھا اور گرمیوں میں بس موٹی سیاہ بھینس جیسی کھال پسینہ کی بوندوں تلے شہد بیر کی بیٹھ کی مانند چمکتی رہتی تھی۔ سر میں بال اتنے تھے جتنار یگستان میں سبزہ مگر چنبیلی کا تیل اس میں پابندی سے کھپایا جاتا تھا۔ جڑیں ہمیشہ تر دکھائی دیتی تھیں آنکھ، ناک، چہرہ مہرہ سب اللہ کے بنائے ہوئے تھے ان کا ذکر ہی کیا کرنا، مرد کی صورت کون دیکھتا ہے اس کی تو سیرت دیکھی جاتی ہے۔

مکاک پہلوان کا سلسلۂ نسب بقول ان کے شاہی زمانے کے حلوائیوں سے ملتا تھا۔ ان کے نانا کے سگے ماموں شہر آبادی میں دلی کے آخری تاجدار کو پاؤ بھر دودھ کا ابخورہ روز بھیجتے تھے۔ ایک زمانہ تھا دلی کا ہر دکاندار کچھ اسی قسم کی کہانیاں

سناتا تھا۔ چمن بھرّ بھو بج کہتے تھے کہ ان کے پُرکھوں نے اکبر شاہ ثانی کو بخنے کھلائے تھے۔ تب ہی سے ان کے خاندان کے بخت جاگے۔ واللہ اعلم بالغیب۔

میاں مکاک کے دودھ میں ایک کمال تو ہم نے بھی دیکھا تھا اور وہ یہ تھا کہ چاہے وہ کتنا ہی دودھ بیچ لیں رات کے درمیانی حصے تک کڑھاؤ بھرا کا بھرا دکھائی دیتا تھا۔ خدا جانے پاس رکھی بالٹی میں سے پانی ملائے جاتے تھے یا کوئی وظیفہ ایسا آتا تھا۔ اور لطف یہ کہ نہ دودھ کا مزا خراب ہوتا تھا اور نہ قوام ٹوٹتا تھا۔ ایسا ذائقہ دار کہ ایک بار منہ کو لگے تو چپنے اور غلام کی طرح جیتے جی نہ چھوٹ پائے۔ ٹھنڈا کرنے کے لئے جب وہ آبخورے سے بلٹو کے میں چار پانچ دفعہ دودھ انڈیلتے تو ایک ڈیڑھ گز لمبی لکیر چاندی کی آبشار کی طرح اوپر سے نیچے گرتی دکھائی دیتی تھی۔ اسی وجہ سے ایک نیپالی بیچارے نے ایک مرتبہ ان کی دکان پر آکے بھولے بھولے منہ سے کہا تھا:

" پہلوان جی، ایک گج دودھ ناپ دیو" پہلے تو وہ سمجھے نہیں لیکن جب بات سمجھ میں آئی تو شاید اپنی زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ جی کھول کر ہنسے تھے۔

مکاک پہلوان نے لنشیر والوں کے اکھاڑے میں زور کئے تھے۔ ان کا جسم گینڈے کی طرح سخت تھا۔ خوب سیسہ پلایا ہوا۔ اور کسی زمانے میں پھرتی اس غضب کی تھی کہ جب وہ کشتی لڑتے تھے تو اچھی سے اچھی جوڑ کو آناً فاناً مار لیتے تھے۔ مگر اب دودھ کے بیوپار نے انھیں ٹھیلا بنا دیا تھا۔ جب آدھی رات ادھر اور آدھی رات اُدھر ہوتی تب کہیں جا کر دکان سے چھٹکارا ملتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے گھٹنے جڑ جاتے تھے اور کمر تختہ ہو گئی تھی وہ پہلا سا لوچ لچک چیتے کی سی پھرتی خدا جانے کہاں چلی گئی تھی جس کا رنگین فسانہ وہ خود دودھ ٹھنڈا کرتے وقت گاہک کو مزے لے کر سناتے تھے۔ غالباً

یہ ہوتا ہوگا کہ ہمارا دودھ بیو گے تو ایسے ہو جاؤ گے یا پھر اپنے بھلے بُرے وقت کو یاد کر کے جی بہلاتے ہوں گے۔ ان کی نظر میں ہمارے دور کے نوجوان خاک نہ جچتے تھے، سوکھے سہمے نری ہڈیوں کی مالا جیسے قحط کی پیدائش ہوں۔ دو چلو خون ہی نہ دکھائی دیتا تھا۔ چہرے دیکھو تو دیوار والیوں کے پیٹ کی طرح پیلے پڑے ہیں۔ منحنی ہاتھ پاؤں کبوتر کے سینے، مور کی ٹانگیں۔ جسے دیکھئے کباب دری بنا پھرتا ہے۔ ان کے زمانے میں دُبلا پتلا آدمی بھی کن دار ہوتا تھا۔ نرے ڈھاک کے پتے نہ تھے خود ان کی کلائیوں میں ایسی جان تھی کہ مست بجار کے گاؤ مکھ لگائیں تو سالا چوپٹ گر سے۔

جھوٹ بولنا مذہبی نقطۂ نگاہ سے کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو اس کی مجلسی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جھوٹ کے بغیر بات چیت کا لطف ہی نہیں آتا۔ نری پھیکی سیٹھی بے مزا رہتی ہے۔ مکاک پہلوان جی بھر کر جھوٹ بولتے تھے۔ ان کی پہلوانی تو جس نے دیکھی ہوگی وہ بے چارا جوانا مرگی میں گیا ہوگا۔ ہاں اس پہلوانی کے قصے ان کی زبان سے سنتے سنتے پورا محلہ عاجز آ گیا تھا۔ کسی اور نے تو شہادت دی نہیں پر وہ سُناتے تھے تو ان کے جھوٹ پر بھی سچ کا گمان ہوتا تھا۔ جالندھر کا بڑے سے بڑا پہلوان ان کے نام سے بیری کی طرح کانپتا تھا اللہ بخش امرتسر والے سے برابر کے زور ہوئے تھے لاہور میں لڑنے گئے تو ڈھیروں سونا چاندی اور ستائش کے ڈونگرے سمیٹ کر لائے۔ ایک مرتبہ کسی فرنگی پہلوان نے بھی بُل کی لی تھی، وہ ہندوستانی پکڑ تو جانتا نہ تھا۔ کھلے ہاتھ پیروں والی کشتی ہوئی۔ بھائی مکاک نے دو چار جھبول جیسے گھونسے کھائے اور پھر بڑھ کے ایک مکا لگایا تو اگلے کے ہوش اُڑ گئے۔ تیورا کر گرا تو بکرے کی بولی بولنے لگا۔ اس کے بعد تو ولایت میں ان کے نام کا ایسا چرچا ہوا کہ ملکہ وکٹوریہ نے بلانے کے لئے

بیسیوں مرکا رے بخشے، البتہ وہ یہی کہتے رہے کہ بڑا نوالا کھائے بڑا بول نہ بولے۔ میں کان پکڑ کے اکھاڑے میں اترتا ہوں۔ کسی کو للکارنا ہمارا شعار نہیں جس کی ماں نے زیادہ دودھ پلایا ہے وہ یہاں آکر لڑے۔ استاد کی اجازت بغیر پرائے دیس میں مستنڈے فرنگیوں سے گتھم گتھا کریں ہمیں کب زیب دیتا ہے۔ لیجئے صاحب کیا پاگل کتے نے کاٹا ہے کہ گھر چھوڑ باہر کمالات کا مظاہرہ کریں۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ پتھر اپنی جگہ بھاری ہوتا ہے۔ آدمی کو چاہئے جہاں تک ہوسکے بڑائی کا کلمہ زبان پہ نہ لائے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہمارے ہاں کے لونڈے لارے وہ فن جانتے ہیں کہ باہر والے سو دفعہ مر کے جئیں تو بھی نہ سیکھ پائیں۔ پہلوانی کا ہنر جناب بو تراب سے چلا آتا ہے اور اس کے نکتے سینہ بسینہ استادوں سے ہوتے ہوئے ہم تک پہونچے ہیں۔ خدا ان کی قبروں میں نور بھرے بھلا یہ فن انگریزوں سے لڑ کے ہم انہیں بھی سکھا دیں۔ مجھ کو ناداں نہ سمجھ۔ خوب سمجھتا ہوں تجھے۔ ایک دن بڑے رازدارانہ انداز میں کہنے لگے یاد رکھو طاقت کا مقابلہ طاقت سے نہیں کرتب سے کیا جاتا ہے۔ ہاتھی کے تن و توش کو چیونٹی مار گراتی ہے۔ ہندوستانی کشتی کی رکان جس کے پتے پڑ گئی وہ پہاڑ جیسے دشمن پہ بھاری پڑتا ہے۔ اللہ کے کرم سے ہم نے سیکڑوں کشتیاں لڑیں۔ بہت سی ماریں اور اور کچھ میں برابر چھوٹے مگر آپ کی دعا سے کوئی مائی کا لال دونوں کھووں کو مٹی نہ لگا سکا۔

مکاک پہلوان اپنے ساتھ ساتھ اپنے پیر بھائیوں کے قصے بھی مزے لے کر سناتے تھے۔ یک نہ شد دو شد۔ ان کے ایک ساتھی کی ہتھیلی پہ چاندی کا روپیہ رکھو تو دہرا کر دیتا تھا۔ بیچارے کو جوانی میں نظر کھا گئی۔ ایک بار نے بھینس کی کمر پہ دو ہتھڑ مارا تو ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔ ایک دوست جب اکھاڑے میں اترتے تھے تو پاؤں کا نشان مٹی

پر نہ آتا تھا۔ شیر کی طرح اڑان کشتی لڑتے تھے۔ ایک تو ایسے بجلی کی مانند وار کرتے تھے کہ بڑے بڑوں کو یہ بتانا مشکل ہوتا تھا کہ کون سی کل مار رہا ہے۔ افسوس ان میں سے کوئی زندہ نہ رہا۔ زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے۔ ایک ملاک اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے ہمیں ان کی کہانی سُنانے کے لئے زندہ بچ رہے۔ ورنہ شاید کوئی نام بھی نہ جانتا ہوتا۔ آدمی اپنی سنگت سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ محاورہ بھائی ملاک نے ازبر کر لیا تھا اسی لئے وہ اپنے ساتھیوں کا رنگ جماتے تھے۔ اور جب ان سب کی دھاک بٹھا لیتے تھے۔ تب کہیں صدر مقام پر اپنا ذکر یوں کرتے کہ انگوٹھی میں نگینہ کی طرح فٹ ہو جاتا تھا۔ خدا کا منکر ہو تو اُن پر ایمان لے آئے۔

سنا ہے ایک دن ملاک پہلوان کا بھوت پریت یا کسی اوپری شے سے مجیٹا ہو گیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ خاصے بوڑھے ہو گئے تھے۔ ہوا یوں کہ جب وہ رات گئے دوکان پر بیٹھے اونگھ رہے تھے تو کوئی شخص اچھے ہاتھ پیروں والا دودھ لینے آیا۔ باتوں باتوں میں سخت کلامی ہو گئی۔ کہتے ہیں آئی بلا ٹلا نہیں کرتی۔ ملاک پہلوان گدی چھوڑ نیچے اتر آئے خوب گُتھم گُتھا ہوتی رہی۔ کبھی یہ نیچے تو وہ اوپر کبھی وہ اوپر تو یہ نیچے۔ انھوں نے قینچیوں پر قینچیاں ڈالیں اور وہ یوں نکل گیا جیسے آدمی نہیں ہوا کا جھونکا ہو۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ کسی نے دیکھا نہ سُنا پھر بھی ملاک پہلوان کو اپنی پہلوانی کا زعم ٹوٹ گیا۔ اُس دن سے ان کے لہجے کا اعتماد بیٹھک کا دبدبہ، آنکھوں کی چمک، نگاہ کی تندی۔ زبان کی طراری سب کچھ جاتا رہا۔ اس واقعے کے بعد وہ کوئی مہینہ ڈیڑھ مہینے جیے ہوں گے وقت سے پہلے موت تو آئی نہیں ملاک کی جگہ ملاک کا مجسمہ بیٹھا رہا۔ البتہ وہ جولانی اور باتیں بگھارنا

سب ختم ہو گیا۔ پھر ایک دن صبح صبح جب نالی صاف کرنے والے جمعدار نے ہائے
ویلا مچائی تو لوگ اپنے اپنے گھر سے نکل ان کی دوکان پر اکٹھے ہو گئے۔ مکاک پہلوان
اپنی دُکان کے تختے پر چاروں خانے چت پڑے تھے اور ان کی ننگی کمر کے دونوں
طرف گھوڑوں کے نیچے زندگی میں پہلی بار مٹی لگی تھی۔

گیتی آرا بیگم

گیتی آرا بیگم نے پچھلے بیس برس سے ماہ و سال کا حساب لگانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اُن کی عمر ایک مرکز پہ آ کے ٹھہر گئی تھی۔ گورے چٹے رنگ اور اچھے ہاڑ کی عورت تھیں اس لئے جب وہ اپنے مسّی لگے ہونٹوں کو کچی کلی کی مانند سکیڑ کر بھولے بھولے منہ سے کہتیں کہ ان کی عمر ابھی چالیس بیتالیس سے زیادہ نہیں ہے تو سننے والے کا جی چاہتا کہ ٹھنڈے پیٹوں یقین کرلے۔ جو بے وقوف یقین نہیں کرتے تھے، ان کی خبر لینا گیتی آرا خوب جانتی تھیں۔ وہ جتنی سیدھی تھیں اتنا ہی ان میں فن بھی تھا۔ جس کے پیچھے پڑتیں اس کے لتے لے ڈالتی تھیں۔ سب کا اگلا پچھلا چٹھا انھیں از بر رہتا تھا۔ اور بھلا وہ کون سی کشمکش ہے جس میں تنکا نہیں۔ یہ ان کی مہربانی تھی کہ بغیر چھیڑے کسی کی ٹانگ نہ لیتی تھیں ورنہ آئے دن عقدے کھلتے اور بیٹھے بٹھائے لوگوں کے گھروں کی رسوائی ہوتی۔ پاس پڑوس میں تو کس کی ماں نے

دھونسا کھایا تھا کہ ان کی بات ماننے سے انکار کرتا۔ ہاں کبھی کبھی آئے گئے لوگ اپنے پوتوں سوتوں کو بلواتے تو ان کی گل افشانی گفتار کا اندازہ ہوتا تھا۔ اللہ اللہ دریاؤں کی روانی ان کی زبان کے آگے پانی بھرتی تھی اور کلّہ ایسا کہ آواز کلیجے کے پار ہوتی تھی۔ کوئی ہنسی ٹھٹھہ ہے۔ آخر انھوں نے بیس سیر کا گھی کھایا تھا۔ سینہ اندر سے چربی صندوق کی طرح کشادہ تھا۔ بولتی تھیں تو ہیبت سے دشمن کا زہرہ آب ہوتا تھا۔ البتہ یہی گیتی آرا بیگم جب پیار سے مدھم سُروں میں کسی کو مخاطب کرتیں تو سننے والوں کے کانوں میں شہد کی سی مٹھاس گھل جاتی تھی۔ ہم سے تو بے چاری سدا ہنس کر بولیں اور ایسی پیاری پیاری باتیں کیں کہ اب مرے پیچھے بھی ان کی آواز ہمارے کانوں میں گونجتی ہے۔

گیتی آرا بیگم سنتا ہے کبھی سہاگن تھیں۔ ہم نے تو انھیں ہمیشہ سے بیوہ ہی دیکھا۔ مگر ان کی بیوگی میں ویرانی نام کو نہ تھی۔ مہندی سے رنگے ہاتھ پیر بیر بہوٹی کی مانند ہمیشہ لال رہتے۔ جگر مگر کرتے ہوئے موتی جیسے مصنوعی دانت، ہونٹوں پر لاکھے اور مسّی کی دھڑی، وسمہ چڑھے سیاہ بھونرے جیسے بال، ہاتھوں میں چھپائی سرخ اور سبز تھیں کانوں میں بالی پتے، بدن پر بیل دار سفید یا کسی ہلکے رنگ کا کُرتہ، گریبان میں سونے کے بٹن کی دار لٹیں، ورق دم آڑا پاجامہ، نکھ سکھ سے درست۔ ہر وقت جیتے جاگتے خصم والیوں سے زیادہ بنی ٹھنی رہتی تھیں۔ اللہ سب کو بیوگی میں ان کا سا سلیقہ دے۔ وہ کسی اور کو بھی سادہ سودہ دیکھتیں تو بڑے پیار سے غصے ہوتی تھیں۔ سر جھاڑ، منہ پہاڑ، آئیں بنّو نوبہار، پہلے پھبتی کستیں اور پھر کپڑا لتّا کہنا پاتا پہننے کی تاکید کرتیں۔ پرانے لوگ بڑے دعاگو ہوتے تھے۔ ان کی ذرا طبیعت

خدمت کیجئے تو وہ اپنوں سے زیادہ اپنے ہو جاتے تھے۔ گیتی آرا بیگم بھی محلے میں اس طرح آتی تھیں جیسے وہ سب کی رشتہ دار ہوں۔ دُکھ درد اور شادی، غمی سب میں برابر کی شریک، جوانوں کے تو وہ سامنے ہوتی تھیں کہ ان کے آگے کے بچے تھے اور بوڑھوں سے دو آنکھوں میں فقط ایک ناک کا پردہ تھا۔ ان کا آنا سچ پوچھئے تو کسی کو دو بھر بھی نہ گزرتا تھا۔ ماشاء اللہ بڑا بھاگوان تھا۔ جس گھر جاتیں سہرے کے پھول کھلاتی تھیں۔

گیتی آرا بیگم کا بال نہ بچہ، اکیلا دم، میاں اللہ انھیں جنت نصیب کرے، شادی کے دس بارہ سال بعد ہی مفارقت دے گئے تھے۔ پہاڑ سی عمر کاٹنے کے لئے آخر کچھ تو شغل چاہیے تھا۔ سو انھوں نے شادیاں کرانے کا کام سنبھال لیا۔ شہر کی ساری جوان لڑکیاں اور ان کی جوڑ کے لڑکے انھیں معلوم تھے۔ ان کا اپنا کچھ حساب تھا نائیکا بھید کی مانند۔ جس سے وہ رشتہ کی مناسبت کا اندازہ پہلے ہی لگا لیتی تھیں اور جب منہ سے نکالتیں تو پھر رشتہ کرا کے ہی دم لیتی تھیں۔ ان کے بھروسے پر ماں باپ جھٹ لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دیا کرتے تھے۔ بھلا ان سے زیادہ حسب نسب، عادت اطوار، گھر، گھرانے اور مزاجوں کی مناسبت دیکھنے کی ماں باپ کو فرصت کہاں تھی۔ وہ خود تو گی کی دائی تھیں۔ ایک ایک گھر کی سات سات پشتوں سے واقف تھیں، پھر بھلا کسی کو کیا ضرورت تھی کہ ناحق پریشان ہوتا۔ بعض گھرانوں میں تو وہ پیدا ہوئے بچوں کی عادت و اطوار پہ نظر رکھتیں، اور ان کے لیے پونڈوں کی مانگ بھی تلاش کر لیتی تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ ستواں ناک، اور لمبا قد کس گھر کھپے گا۔ مشکی رنگ اور چھوٹے قد کا جوڑ کہاں ہے۔ دہانہ بڑا ہے

توکس کے گھر منہ پھیلانا چاہیے، اور چھوٹی آنکھ والی کے لئے کون سا کونا جھانکیں۔ غرض جب اپنی طرف کو مطمئن ہو جاتیں تب دونوں طرف جاکر بات کرتی تھیں، اور اللہ گواہ ہے ایسی پنی تُلی بات کرتیں کہ طرفین کو ہاں کرتے ہی بنتی تھی۔ ان کے بسائے ہوئے سیکڑوں گھر ہیں اور جسے دیکھئے اللہ کے تار بجا رہا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ نیت ثابت منزل آسان انھوں نے جس رشتے میں ہاتھ ڈالا خدا کے فضل سے دونوں طرف کے لوگ خوش ہو گئے۔ سب کی بیٹیاں راج رانج رہی ہیں اور بیٹوں کے گھر جنت بن گئے ورنہ یہ کہ اچھی کری خدا نے اور بُری کری بندے نے۔ ذرا ویخ پنچ ہو جائے تو دونوں طرف کی وہ بے بھاؤ جوتیاں پڑتی ہیں کہ اللہ کی پناہ، چونڈا صاف ہو جاتا ہے۔ گینی آرا بیگم فصیبوں کی تیز تھیں، ایسا نازک کام کیا، اور لوگوں کی دعائیں لیتی مریں۔

گینی آرا بیگم لڑکیوں کی پڑھائی سے جلتی تھیں۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ جوان جہان لوٹھا کی لوٹھا کتابیں سینے سے لگا اسکولوں اور کالجوں میں جا رہی ہیں۔ عمریں یوں ڈھلی جاتی ہیں جیسے دوپہر کا سورج۔ ان نگوڑی ماری پڑھائیوں نے لڑکیوں کا روپ رنگ ہی کھا لیا ہے۔ دھوپوں میں پھرنے سے رنگت جھلس جاتی ہے۔ چہرے کی لونا مرتی ہے۔ خدائی خوار پھرتے پھرتے سوکھ کے لقات ہو جاتیاں ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عمر کا وہ حصہ ڈھل جاتا ہے جو گینی آرا بیگم کی نظر میں شادی کا بہترین زمانہ تھا۔ وہ لڑکیوں کے معاملے میں چودہ پندرہ برس کی عمر سے آگے بڑھنے کو تیار نہ تھیں۔ عورت بیسی اور کھیسی۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ موئی جوانی تو کتابوں کے سوگ میں کاٹ دی اور بڑھاپے میں گھر بسا کے بیٹھ گئیں۔ جب ارمانوں کے دن ہی نکل گئے تو آخر چوچلا کرنے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ کسی

بڑی عمر کی لڑکی کا ان سے ذکر کیا جاتا تو بڑی سفاکی سے کہتی تھیں " بوا بہت گئی تھوڑی رہی، اب اللہ اللہ کرنے کا زمانہ ہے یا گو موت کرنے کا؛ چھوڑو اس جھنجھٹ میں کیوں پڑتی ہو۔" پھر اپنی مثال دے کر کہتی تھیں۔ " ہمیں تو میٹھا برس بھی سسرال میں آن کے لگا تھا، ہم کیا جانیں یہ چالیس چالیس سال کے کنوار پنے؟ کیا گدھوں کی عمریں لائی ہیں، ہزار بارہ سو سال کی ہو کے مریں گی۔ واہ واہ! کیا زمانہ آیا ہے کہ عورتیں پڑھ لکھ نوکریاں کر رہی ہیں۔ ہم نے تو یہ سنا ہے کہ عورت کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی۔ شادی کے بعد کبھی کبھار وقت گزارنے کو ہم نے ٹکے دو ٹکے کی مزدوری کی تو ہمارے میاں سینکڑوں صلواتیں سناتے تھے، میں کہتی کہ خالی بیٹھی کیا کروں، اتنے بڑے گھر میں جی نہیں لگتا۔ مگر وہ اللہ بخشے ایسے بگاڑتے کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا تھا۔ کبھی ایک دھیلہ اس مزدوری کا انھوں نے گھر میں خرچ کرنے نہیں دیا۔ جوڑ جوڑ کے رکھتی رہی اور جب خیر سے ہزار بارہ سو ہوگئے تو لو ایسی بچ کر آئی۔ وہ مر گئے اور مجھے مرنا ہے، میں نے اپنے گھر میں کبھی پیسے کوڑی کی تکلیف نہیں اٹھائی۔ ہمیشہ بیگموں کی طرح راج کیا۔ مٹھی بھر رقم تو پان چھالیہ پر خرچ ہوتی تھی۔ آج کل والیاں نگوڑی کیا کھائیں گی جو ہم نے کھا لیا۔ ناک پکڑو تو دم نکلتا ہے۔ بس ایک فیشن نے سب کو بار رکھا ہے۔ تو کیا فیشن والے نامراد کہیں کہ تمھارے منہ پہ ناک بری لگتی ہے تو اسے کٹوا دو گی۔ آدمی کو چاہیے اپنی عقل پہ چلے، پرائی سیکھ نہ لے۔ لوگوں کا کیا ہے لوگ تو دیوانہ بنا کے چھوڑیں گے پھٹکار ان کے منہ پڑ دلایتی والیاں، میں انھیں تو کچھ نہیں کہتی کہ قطامہ میری لگتی کون ہیں، جو چاہیں کریں، مگر ہاں والے ان کی ریس کریں گے تو آپ پچھتائیں گے۔

کوّا چلا ہنس کی چال اپنی بھی چال بھول گیا۔

گیتی آرا بیگم بڑی سلیقے کی عورت تھیں۔ انھوں نے اپنا رنڈاپا عزت سے کاٹ دیا۔ محلّے کے لوگ ان کے چاؤ چونچلے کرتے تھے۔ وہ خفا ہوتیں تو کان دبائے ان کی بُری بھلی بھی سنتے اور پھر ان کے آگے توبہ تلّا کرتے تھے۔ دودھیلی گائے کی لاتیں کون نہیں سہتا سمجھتا سمے تھا اور خوش وقتیوں کے دن، ایک آدمی کا بوجھ سارے محلے پہ کیا گراں گزرتا۔ وہ جہاں بیٹھتیں دو دو رٹیاں کھالیتی تھیں۔ سینا پرونا انھیں ایسا آتا تھا کہ کیا کوئی مغلانی جانے گی۔ بہو بیٹیوں کو ٹانکے بھرنا سکھاتیں تو گھر والے جانتے کہ دوا رکھی ہے۔ غرض یہ کہ وہ جس گھر جاتیں لوگ انھیں یوں رکھتے تھے جیسے آنکھوں میں پتلی، بس گزرے ہے استقبال ہوتا تھا۔

شادی بیاہ کرانا گیتی آرا بیگم کا پیشہ تو تھا نہیں، بس شوق سمجھ لیجئے، یا شاید وہ اسے ایک نیک کام سمجھ کے کرتی تھیں۔ اگلے لوگوں کی یہ ادا بھی خوب تھی۔ دنیا کے اور کاموں کی طرح وہ کوئی کام ایسا بھی کرتے تھے جو لوگوں کی بھلائی کا ہو اور ان کے لئے توشۂ آخرت بنے۔ مرے پیچھے یہی کام آتا ہے۔ کسی بڑے بوڑھے نے سارے محلے کی گوشت ترکاری لادی تو کوئی بڑی بوڑھی بچوں کی ہنسلیاں مونڈھے چڑھانے لگی۔ کسی نے گلی کے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ ان دنوں عام طور سے قرآن شریف گھروں میں پڑھا یا جاتا تھا۔ غرض جو جس سے ہو سکتا تھا انسانوں کی فلاح کے لئے کرتا تھا۔ گیتی آرا بیگم، الٰہی انھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب ہو، شادیاں کراتی تھیں، ان کے دم سے نہ جانے کتنی لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہوئے، لڑکوں کے سر سہرے بندھے۔ آنگنوں میں ڈھولک اور شہنائیاں بجیں۔

سہاگ اور سہاگ گھوڑیاں گائی گئیں۔ ساچق، مایوں اور براتوں کی دھوم دھام ہوئی، چوتھیاں کھیلی گئیں۔ اب وہ نہیں رہیں تو سارے شہر میں سناٹے کا عالم ہے۔ گھر گھر بیریاں ہیں، مگر پتھر آنے کا رواج گیتی آرا بیگم کے ساتھ دنیا سے اٹھ گیا۔

حکیم ٹناٹن

اصلی نام تو اُن کا خدا جانے کیا ہوگا مگر حکیم ٹناٹن کے نام سے انھیں سارا شہر جانتا تھا۔ یہ نام کب اور کیوں مشہور ہوا اس کا علم بھی شاید ان بزرگوں کو ہو گا جو قریب قریب زندگی کے سو سال پورے کر چکے تھے۔ ہماری تو ان کے آگے عمر ہی کیا تھی، سمجھو دودھ پیتے بچے تھے یا بقول ان کے جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش۔ اس بساط پر بھلا ہم ان کا نام جانتے یہ کیسے ممکن تھا۔ ہاں انھیں جانتے تھے، یہی کیا کم تھا، برسوں انھیں دیکھا کیے مگر ان سے پوچھنے کی کبھی ہمت ہی نہیں ہوئی اور سچ پوچھیے تو اس وقت ہمیں اتنا ہوش ہی نہ تھا۔ پھر یہ کہ نام سے کیا لینا انسان اپنے کام سے پہچانا جاتا ہے۔ اور کام ان کا ایسا تھا کہ امیر غریب، بچے بوڑھے سب ہی ان کے احسان مند تھے۔ جس دن سے دلی میں آئے اور املی کی پہاڑی کے سامنے چوہیا میم کے چھتے میں انھوں نے مطب کیا۔ اس دن سے لے کر آخر

دم تک علاقے میں اول تو بیماری آئی نہیں اور اگر بھولی بھٹکی کبھی آن گھسی تو راتوں رات اسے کان دبا کے کھسکتے ہی بنی۔ بھلا مرض کا کیا بوتا تھا کہ حکیم ٹناٹن کے آگے ٹک جاتا۔ وہ خاندانی حکیم تھے اور انہیں ایسے نسخے یاد تھے کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے مردے کے کان میں پڑھ کے سنائیں تو کلمہ پڑھ سیدھا اٹھ بیٹھے۔ زندوں کی بات اور تھی وہ جہاں بیماری ناگہانی کا مقابلہ کرتے ان کے دو چار نسخے بھی صاف پی جاتے تھے اور بستر سے اٹھنا تو درکنار ذرا ٹس سے مس نہ ہوتے تھے۔ یہی بات حکیم ٹناٹن کو ناگوار گذرتی تھی وہ کہتے تھے دوا کا کام طاقت کو بحال کرنا ہے طاقت بخشنا تھوڑی ہے۔ یہ صفت تو خدا نے غذا کو بخشی ہے۔ آج کل جسے دیکھئے کھانے پینے سے زیادہ پہننے اوڑھنے پر توجہ دیتا ہے۔ اسی لئے ارنڈ کی طرح اندر سے کھوکھلا ہے۔ ذرا سی بیماری آئی اور اس کے ہاتھ پیروں نے جواب دے دیا۔ ہمارے زمانے میں تو پہلے کچھ دن تک بیماری کا علاج ہی نہ کیا جاتا تھا۔ بس اندر ہی اندر مریض کی طاقت اور بیماری کے زور کا مقابلہ ہوتا رہتا اور سنو میں سے نوے مریض تو یونہی ٹھیک ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی بیماری کا غلبہ زیادہ ہوتا تو مفرح جات اور مقویات کھلاتے اور آدمی گھڑی بھر میں بھلا چنگا ہو جاتا تھا۔ اب تھوڑی کہ دنیا کی دوائیں پیٹ میں جھونک دیجئے اور نتیجہ وہی صفر۔ بیماری رہی ہے کہ مریم سے ٹلیم نہیں ہوتی۔

حکیم ٹناٹن خود بھی کھانے پینے کے بہت شوقین تھے۔ صبح اٹھ نہار منہ ایک آملہ اور چاندی کا ورق کھاتے، پھر بادام کے حریرے سے ناشتہ کرتے اور اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوتا تو رات کو سوتے وقت انڈے اور دودھ پر جاکے رکتا تھا۔ صحت ماشاءاللہ اونہہ، اب تو بے چارے مر گئے۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے۔

ایسی تھی کہ سو سے اوپر عمر پائی اور چلتے ہاتھ پیروں انتقال ہُوا۔ مرنے سے دو چار دن پہلے جب بدن کے کَل ٹوٹنے لگے تو جھلّائے جھلّائے پھرتے تھے کہ لیٹا تو بس لیٹا۔ ہمت سے چلوں پھروں گا تو آپ ٹھیک ہو جاؤں گا۔ بیچاروں کو یہ کیا خبر تھی کہ وقت آن پہنچا ہے۔ اب ہمت، طاقت سب دھری رہ جائے گی۔ جو پیدا ہوا ہے اُسے موت کا مزا ضرور چکھنا ہے۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

حکیم ٹماٹن کا رنگ بڑھاپے میں بھی سرخ و سپید تھا۔ گندمی رنگ پر تنمند خون موجیں مارتا تو چہرہ شادابی سے پھول کی مانند کھل جاتا تھا۔ زندگی میں تو کبھی ان کی داڑھی دیکھی نہ تھی، کیونکہ وہ ہمیشہ اُسترے سے کھونٹیاں تک نکلواتے اور اپنے تئیں چودہ برس کے بنے رہتے تھے مگر جب انتقال ہوا تو چہرے پر خشخشی سی بکھری ہوئی تھی اور خدا جانے ان کا رنگ مرے پیچھے بھی بیاہا کیوں نہ پڑا۔ ایسا لگتا تھا جیسے خوان میں تبارک کی روٹی رکھی ہو۔ ان کا ناک نقشہ بھی دیکھنے کے لائق تھا۔ تصویر کی مانند۔ ناک ایسی جیسے پہاڑی طوطے کی چونچ نتھنوں پر سے خم کھا کے جھکی ہوئی اور ہونٹ نہ اتنے پتلے جتنے بدمنی عورت کے ہوتے ہیں۔ اور نہ موٹے، بالکل موزوں تھے۔ لال لال بیر بہوٹی کی مانند اوپر کے ہونٹ میں بیچ کی مثلث ذرا اُبھری ہوئی تھی۔ یہ ہونٹ بات میں کھلتے تو اندر سیدھی قطار سیب جیسے دانتوں کی یوں جھکتی جیسے دانت نہ ہوں سچے موتی ہوں۔ مجھے اُن کی آنکھیں بہت پسند تھیں، پھر ان میں جو سرخ ڈورے سے پڑے رہتے وہ ان کے دبدبے میں بلا کا اضافہ کرتے تھے۔ بیر بہوٹی ان کی طرح تپتی آنکھیں جب محبت پہ اُتر آتیں تو لالہ زار کی طرح خنک ہو کر دیکھنے والوں کو لوریاں دینے لگتی تھیں۔ ان آنکھوں میں خلوص کی گہرائی بھی تھی اور سچائی کی

چمک بھی۔

وہ اچھے حکیم تھے یا نہیں، اس کا فیصلہ تو وہ کرے جو اُن کا مریض رہا ہو، مگر ہاں وہ ایک اچھے انسان ضرور تھے، دواؤں میں تو ان کا ایمان صرف دواءُ المسک اور جوارشِ جالینوس پر تھا، جن میں پہلی کا بنانا بقول ان کے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ قوام اور آنچ کو اس طرح دیکھا جاتا جیسے کیمیا تیار کرتے ہوں، دوسری البتہ بنانی آسان تھی اسی لیے وہ صرف اسی سے کام چلاتے تھے۔ ان کی خوبیاں وہ بیان کرتے تو معلوم ہوتا بوعلی سینا کی کوئی تصنیف پڑھ رہے ہیں۔ خیر اب ان باتوں کو چھوڑیئے آپ ان کا پورا حلیہ سن لیجیے کہ آنکھوں دیکھے کا اثر کانوں سنے سے زیادہ یقینی ہوتا ہے۔ ان کا قد سرو کی مانند لمبا تھا بقول غالب انگشت نما اور شانے چوڑے، سینہ اتنا کشادہ کہ بنیان خریدنے کے لیے صدر بازار جانا پڑتا تھا۔ چھوٹے موٹے دکاندار تو بس چھوٹے موٹے ہی سائز رکھتے ہیں۔ حکیم ٹناٹن بھلا ان میں کیسے سما جاتے۔ ہاتھ خوب لمبے تھے بیچ کی انگلی سیدھے کھڑے ہونے پر گھٹنے کے نچلے حصے کو چھوتی تھی۔ پنجہ بھی بڑا تھا۔ پاؤں ہاتھ کی مناسبت سے ذرا چھوٹے تھے اور پنجے ہمیشہ صاف ستھرے رہتے تھے، گلدستہ کی مانند ان پیروں میں وہ ریشم کے کام کی سچی پوری جوتی پہنتے تو یہ دلہن کی طرح سجے سجائے دکھائی دیتے تھے۔ حکیم صاحب کا لباس بڑا خوبصورت تھا۔ وہ ہمیشہ صوفیانہ سے پھولدار کپڑے کی شیروانی اور بڑی مہری کا ایک بڑا پاجامہ پہنتے تھے۔ پاجامے کی موری کے نچلے حصہ پر سفید چھ تاری سے ہلکا سا کنگورا بنا ہوتا تھا۔ بڑے وضعدار آدمی تھے جو لباس اور جو طریقے ایک بار اپنالئے ساری عمر اُن پر کاربند

رہے۔

حکیم ٹناٹن میں ایک بات لاکھ روپے کی تھی وہ ہر ایک کی آگ میں کود پڑتے تھے۔ طبیب تو اپنے منہ میاں مٹھو وہ بڑے حاذق اور عیسیٰ نفس تھے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ بس کام چلاتے تھے اور کام چلانا بھی کیا یہ تو اُن کا شوق تھا ورنہ دولت اُن کے پاس الغاروں تھی۔ کسی پیشہ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پیسہ دھیلا تو کسی سے لیتے نہ تھے الٹی اپنے پیسے سے بنائی ہوئی دوائیاں مفت بانٹ دیتے تھے، یا پھر نسخے اور بنانے کی ترکیب بتاتے اور انشا اللہ خیر صلا نہ لینا ایک نہ دینا دو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ حکیم ٹناٹن خدائی خدمت گار تھے۔ دشمن کو بھی کوئی کام آپڑے تو یہ آدھی رات کو اس کی مدد کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ پھر یہ حکام سے لڑ مر کے لوگوں کا کام کرا ہی دیتے تھے۔ خود تو ماشاء اللہ کھاتے پیتے تھے کسی سے دبنے کا سوال ہی نہیں اور طبیعت اللہ نے بڑی بے نیاز دی تھی۔ ذرا کسی نے آئیں بائیں شائیں کی۔ ٹالم ٹولی سے کام لیا اور انھوں نے بے نقط صلواتیں سنائیں۔ لحاظ یوں تو ہر ایک کا کرتے مگر جب کوئی فرعونیت پر اتر آتا تو ایسی گالیاں سناتے کہ اس کی طبیعت صاف ہو جاتی تھی۔ جب تک زندہ رہے پورے محلے میں کسی پر کڑا وقت نہ آنے دیا اور حکام بالا دست ان کی گلی میں گھسنے سے کتراتے تھے۔ قرقیاں واپس ہو گئیں۔ سزائیں معاف کر دی گئیں، بڑی بوڑھیوں کے وظیفے ہوئے۔ غریب بچوں نے تعلیم مفت پائی اور دکاندار خواہ مخواہ دفتروں میں رشوت دینے سے بچے رہے۔ غرض

ان کے دم سے کیا کچھ نہ ہوا ہر ایک نے چین کی بنسی بجائی اور میٹھی نیند سویا۔ اُن کے جیتے جی تو ان کی قدر نہ ہوئی، بس سامنے پڑے تو سلام دُعا کرلی۔ اب وہ نہ رہے تو ان کی انسان دوستی، خلوص، محبت اور ایثار و قربانیاں یاد آتی ہیں، اور ان جیسا دیکھنے کو کوئی نہیں ملتا۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

▲

چمن بھڑبھونجا

کلو خواص کی حویلی کے سامنے جو مسجد ہے اس کے نیچے ابھی کچھ دن پہلے ایک چمن بھڑبھونجے کی دکان تھی۔ آدمی تو وہ کالا، پیلا، لاغر اور کمزور سا تھا مگر آدمیت کا احساس بڑا حسین اور قوی رکھتا تھا۔ مذہب کے اعتبار سے ہندو تھا اور کاروباری پڑوس اتفاق سے مسلمان ملا تھا۔ اس پڑوس کا اثر قبول کرنے میں اس نے کبھی کسی قسم کی تنگ نظری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مسجد کی دیوار تلے بعض بیہودہ مسلمان یا اُن کے بچے موتنے بیٹھ جاتے تھے۔ چمن انھیں دیکھتا تو فوراً پاس جا کے تنبیہ کرتا تھا "میاں ہم ہندو ہیں اور پچاس برس سے یہاں بھاڑ جھونک رہے ہیں۔ مسجد کی دیوار تلے تو کیا کبھی مسجد کی طرف مُنہ کر کے بھی پیشاب نہیں کیا۔ تم کیسے مسلمان ہو کہ اللہ کے گھر کی بے ادبی کرتے ہو، شرم نہیں آتی۔ بھائی کچھ تو خیال کرو۔

رمضان دلّی میں بڑے اہتمام سے منائے جاتے تھے۔ کل کی بات ہے کہ رمضان المبارک میں کوئی غیر مسلم بڑ شاہ بلا سے ادھر مسلمانوں کی آبادی کی طرف بڑھتا تو پہلے اچھی طرح منہ صاف کر لیتا تھا۔ میر عاشق کے کوچے سے لے کر بیرم خاں کے تہرائے تک کوئی شخص خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، بیڑی سگریٹ پینے یا پان کھانے کا تو قصد بھی نہ کرتا تھا۔ دلّی کے ہندو بڑی فراخدلی سے رمضان کے مہینے اور روزے دار کا احترام کرتے تھے۔ ان کی عورتیں اپنے بچّوں کو لئے مغرب کے وقت انبوہ در انبوہ مسجد کے دروازے پر آ بیٹھتی تھیں اور بڑی عقیدت کے ساتھ نمازیوں سے ان بچوں پر دم کراتی تھیں۔ سودے والے، دکاندار، کارخانوں کے مالک، بیوپاری، آڑھتی بلا لحاظ مذہب و ملت رمضان کے لئے ایک خاص جذبہ اپنے دلوں میں عزت اور احترام کا رکھتے تھے۔ دلّی کی مہترانیاں عصر اور مغرب کے درمیان روزہ رکھتی تھیں۔ جن کے کلے میں سدا پان کی گلوری رہتی تھی وہ بھی رمضان میں اپنے ججمانوں کے گھر آتیں تو منجھے منجھائے دانت اور صاف ستھرے منہ لے کر آتی تھیں۔

محرم کی دس تاریخ کو تعزیے نکلتے تو ان کے ساتھ مہتروں کے اکھاڑے بھی چلتے تھے۔ ان کے جوش و خروش، جذبے اور ماتمی انداز کو دیکھ کر یہ خیال کرنا مشکل تھا کہ یہ لوگ اسلامی برادری سے الگ کسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مہتروں اور مسلمانوں کے بہت سے شوق مشترک تھے، دونوں پہلوانی کے شائق تھے۔ تیتر لڑاتے تھے۔ بٹیرے پالتے۔ مینڈھے لڑاتے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ مہتروں کو اپنے نیچ کبھی تحقیر کا احساس نہ ہوتا تھا اس لیے وہ بھی ان کے

استادوں، خلیفاؤں، پیراکوں، اور فن شناسوں کے آگے دو زانوں بیٹھ جاتے تھے۔

دِلّی ایک خانقاہی شہر تھا۔ بائیس خواجگان کی چوکھٹ، ان کے مزارات پر عرس، فاتحہ، اور دوسری رسومات کا سلسلہ تقریباً بارہ مہینے چلتا تھا۔ فقراء اور اولیاء اللہ کے درباروں میں ہندو، سکھ، عیسائی سب ہی آتے تھے اور دیکھنے والوں کو یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا تھا کہ کون مسلمان ہے اور کون غیر مسلم۔ ہر شخص ایک ہی رنگ میں رنگا دکھائی دیتا تھا۔

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

دلّی والوں کا یہ اتحاد اور یگانگت کسی سیاسی دستور کی بنا پر نہیں تھا اور نہ اس کے لئے نام نہاد کوششیں کی گئی تھیں، بلکہ یہ سب یہاں کے لوگوں کے ایثار، خلوص، نیک نیتی اور بھلنساہی کی برکت تھی۔ دلّی کی اس مرنجان ومرنج تہذیب نے ہمیشہ انسان دوستی اور محبت کو فروغ دیا۔ دلّی ایک دن میں نہیں، ایک سال میں نہیں، ایک صدی میں نہیں، قرنوں میں بنی تھی اس لئے اس کا جادوئی اثر بھی دیرپا اور دائمی تھا۔

تہذیب کمہار کے آوے کی طرح انسانیت پر جو رنگ چڑھاتی ہے، وہ پختہ ہوتا ہے۔ تہذیب کا تعلق نمائش سے نہیں، عقیدے اور اقدار سے ہے۔ تہذیب ہمارے ظاہر کے بجائے ہمارے باطن میں تبدیلیاں لاتی ہے۔ اسی لئے تہذیب، سیاست اور حکمرانوں کی شعبدہ بازیوں کی طرح نامعتبر نہیں، ریاکار نہیں، زمانہ ساز نہیں۔ اہرام مصر کے معماروں نے اس کی بلند پیشانی پہ

یہ عبارت کندہ کی ہے کہ ہم نے تو یہ شاندار کارنامہ برسوں کی محنت اور جانفشانی سے انجام دیا ہے، تم چاہو تو اسے ایک دن میں گرا دو۔ سو دلّی بھی زبان حال سے فریاد کرتی ہے اور اس افراتفری کے دَور میں پکار پکار کر کہتی ہے کہ جو لوگ مجھے مٹانے کے درپے ہیں وہ آپ اپنے پاؤں پہ کلہاڑی مارتے ہیں۔ پچھتاؤ گے، سنو ہو، یہ بستی اُجاڑ کے۔

دلّی والوں کا ذکر کیجیے تو خود بخود دلّی کی باتیں زبان پہ آجاتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ دلّی اور اس کے مکینوں میں ایک معنوی ربط تھا۔ دلّی کے چھوٹے بڑے، امیر، غریب سب اس شہر کے ایسے متوالے اور یہاں کے قرینوں کے اتنے رسیا تھے کہ ان کی ذات میں اس شہر کی خو بو سما گئی تھی۔ پھر جب آسمانی آفتوں اور وقت کی افتاد نے شہر ہی کو تاخت و تاراج کر دیا تو رفتہ رفتہ شہر والے بھی افسانہ ہو گئے۔ اب تو وہ مثل ہوئی کہ دلّی در گور اور دلّی والے در کتاب۔ بہرحال چپّہ چپّہ پر ایسے نشانات ضرور موجود ہیں جو مجھ ایسے نا اہل اور کوتاہ بیں کو یاں کی داستان سنانے پر آمادہ کرتے ہیں اور بھائی آگے توفیق سمجھنے کی جسے اللہ دے گا وہ سمجھے گا، ورنہ بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ، آپ جو چاہے کہہ لیجیے وہ حسد سے دلّی کو بُرا ہی کہتے رہیں گے۔

ہاں تو میں تمہیں بھڑبھونجے کا ذکر کر رہا تھا۔ وہ بھی عجب درویش آدمی تھا۔ صبح نہ جانے کس وقت دکان پر آکے بیٹھ جاتا تھا کہ جب نمازی نماز کو جاتے تو وہ اسے بیٹھا دیکھتے تھے۔ ان دنوں لوگ دیر سے اٹھنے کے عادی نہ تھے۔ نماز بھی سو میں سے پچاس ضرور پڑھتے ہوں گے۔ اور جب نماز پڑھ کے لوگ اپنے گھر لوٹتے تھے تو ناشتہ

کے لئے چمن سے زمردوں یا بھیا ستو لے کر لوٹتے تھے۔ اُن دنوں چائے وائے کا رواج تو تھا نہیں۔ آ گئی تھی مگر لوگ اسے منہ کم لگاتے تھے۔ سنا ہے شروع شروع انگریزوں نے ہندوستانیوں کو اس کی عادت ڈالنے کے لئے چائے کی پڑیاں مفت بانٹی تھیں اور کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ان پڑیوں کے ساتھ دودھ کے پیسے بھی دیئے جاتے تھے۔ بھلا ہو اس خانہ خراب کاروبار کا جس میں آدمی اپنے فائدے کے لئے دوسروں کی جانوں سے کھیلتا ہے۔ خیر دلّی میں تو ہمیشہ شربت، ستّو اور حلوہ بیڑوی کا ناشتہ ہوا۔ چمن ستو بڑے اچھے بناتا تھا اور خاص کر بھیا کے ستّو تو ایسے سوندھے ہوتے کہ میں کیا بتاؤں، خوشبو بہ جیوڑا ڈولتا تھا۔ دلّی کا موسم ہمیشہ سے گرم ہے۔ مئی جون میں تو لُوہ کے ایسے تھپیڑے پڑتے ہیں کہ خدا کی پناہ، خالی پیٹ ہو تو آدمی ٹھیکی بھی نہ کھائے اور کہیں دھوپ میں چل پھر کے آؤ تو غٹا غٹ پانی پینے سے بھی جی کو ضرر ہوتا ہے اس لئے دلّی میں ستوؤں کا عام رواج تھا۔ دن میں کئی کئی مرتبہ جب ذرا لو نس کی شکایت ہوئی تو گھولے اور ستّو پی لئے۔ آنکھوں میں طراوت آجاتی تھی۔

سنا ہے چنا ایک دن بارگاہ ایزدی میں فریادی بن کے حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ لوگ میری جان کے دشمن ہیں۔ کسی طور نہیں چھوڑتے۔ ابھی میں پوری طرح تیار بھی نہیں ہوتا کہ بوٹ کی شکل میں سب مجھے کھانے لگتے ہیں۔ پھر جب پک چکتا ہوں تو کوئی اُبال کر کھاتا ہے کوئی بھون کر ٹھونگتا ہے، کوئی بیس کر دلّی پکاتا ہے غرض یہ کہ ہر طرح کھایا جاتا ہوں۔ اللہ میاں نے منہ پھیر کے جواب دیا "چل یہاں سے دُور ہو، ورنہ ہم بھی تجھے کھا جائیں گے۔" دلّی میں لوگ بیج صبح چنے ضرور کھاتے تھے

سنا ہے حضرت سلامت بہادر شاہ ظفر کو بھی ہر روز سویرے سویرے سونے کی طشتری میں تولہ بھر چنے پیش کئے جاتے تھے۔ میاں چھمن کہتے تھے کہ یہ شرف ان کے بزرگوں ہی کو حاصل تھا، چھمن کے چنوں کا یہ کمال تھا کہ سارے ایک رنگت کے ہوتے تھے مولسری کے پھولوں کی مانند، اور ٹھڈیاں دیکھئے تو نام کو نہیں۔ بھاڑ تو سب ہی بھونتے ہیں، اور چنے بھوننا کونسی بڑی بات ہے، مگر وہ جو کہتے ہیں آدمی کا سلیقہ گھاس کھودنے میں بھی ظاہر ہوتا ہے، سو چھمن کے چنے نگینہ ہوتے تھے۔ کلیجے تک سنکے ہوئے، اور مجال ہے کہ ذرا تیز ہو جائیں۔ ہلکی جھیپٹی رنگت میں ایسے پھولتے تھے کہ مکئی کے برابر ہو جاتے تھے اور جہاں دانت کے نیچے آئے ریزہ ریزہ ہو گئے۔ چنے یوں تو سب لوگ پسند کرتے ہیں مگر دلّی والے اس کے بڑے رسیا تھے۔ نزلہ زکام کے لئے ایک پر ایک دوا ہے۔ گرم گرم چنے رومال میں لے کر سونگھئے تو دماغ تازہ ہو جاتا ہے کیسا ہی نزلہ ہو کچھ دن میں آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ صبح کے وقت تولہ دو تولہ چنے کھانے کا دلّی میں عام رواج تھا۔ گلی گلی چنے والے آتے تھے، مگر شوقین حضرات تازہ چنے بھڑبھونجے کی دکان سے لے کر کھاتے تھے۔ لڑکی گول ٹوپیاں سروں پر ہوتی تھیں اتاریں اور چھمن کے آگے کر دیں۔ چنے جیسی چیز بھی کہیں تل کر بکتی ہے۔ سستے سمے تھے، چھمن بھی دمڑی میں مٹھی بھر چنے ٹوپی میں ڈال دیتے تھے۔ اب دیکھئے تو خدا کی پناہ چنے بھی سونے کے مول بک رہے ہیں جس کی گرہ میں دام ہوں تو وہ کھا سکتا ہے۔ غریب بے چارہ تو دیکھتا رہ جاتا ہے۔

ہم جب اسکول جاتے تھے تو ہم نے چھمن کو اپنی دوکان پہ بیٹھے دیکھا ہے دیکھا کیا ہے اس سے مدت تک چنے لئے ہیں۔ بھاڑ کی ریتی چھتے چھتے رنگت بالکل

سیاہ ہو گئی تھی۔ جسم سرا پنچ کے بانس کی طرح سوکھا اور لمبا تھا۔ دانت ذرا بڑے،
اور باہر نکلے ہوئے تھے، جیسے مخلص آدمی کے ہوتے ہیں۔ منڈے ہوئے سر پہ چوٹی
انگشت شہادت کی طرح کھڑی رہتی تھی۔ آنکھیں ایسی پیلی جیسی یرقان زدہ آدمی
کی ہوتی ہیں۔ خوب لمبے ہاتھ اور بڑی انگلیاں تھیں۔ پہاڑ کی گرمی سے ناخن
تک کالے ہو گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اللہ میاں کی بھینس بیٹھی ہو۔ چھمن کے جسم
پر جاڑے گرمی ایک بنڈی اور ایک لنگوٹی ہوتی تھی۔ کسی دن صاف ستھرے کپڑے
پہنتا تو خاصا بھلا آدمی لگتا تھا، مگر اس کے پیشے نے اس کی وضع بگاڑ رکھی تھی۔ سر
سے پیر تک پسینے میں نہایا رہتا اور اس پر جو گرم گرم ریت جمتی تو مساموں کے اندر تک
بیٹھ جاتی تھی۔ لنگوٹی، بنڈی، انگوچھا سب دھوئیں کی رنگت میں رنگ جاتے تھے اور چھمن
کھڑ بھڑ بھوت بنا جیسے سنگ اسود کا تراشا ہوا مجسمہ لگتا تھا۔

چھمن کی زبان بڑی میٹھی تھی۔ وہ جس طرح بڑوں سے دکانداری کرتا تھا
اسی طرح بچوں سے بڑی محبت کے ساتھ پیش آتا تھا۔ دمڑی، پائی اور دھیلے کے
خریداری میں ہزار طرح کے نخرے کرتے تھے۔ کبھی کہتے یہ لیں گے اور کبھی کہتے وہ لینگے
مگر چھمن کی پیشانی پر بل نہ آتا تھا۔ گھنٹوں ان کے اشاروں پہ ناچتا رہتا تھا۔ وہ کہتا
تھا کہ بچوں میں گھرا رہے تو آدمی کی سہن شکتی بڑھتی ہے۔ جمعرات کی شام کو عصر اور
مغرب کے درمیان چھمن کبھی کھیلیں اور کبھی گڑ کے چنے بچوں میں بانٹتا تھا۔ یہ ادا بھی
اس نے مسلمانوں کی اپنائی تھی وہ نوچندی جمعرات کو خوب اچھی طرح نہا دھو کر صاف
ستھرے کپڑے پہنتا اور حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کی درگاہ پہ حاضری دیتا
تھا۔ قوالی اسے بہت پسند تھی، موسیقی اور بول تو کیا خاک سمجھتا ہوگا البتہ جب سماں

بند عقا تھا تو اس پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

چھمن بڑی خاموش طبیعت اور سنجیدہ مزاج کا آدمی تھا۔ میں نے اسے عام آدمیوں کی طرح کبھی بولتے نہیں دیکھا۔ جنگلی قبر دلی کا بڑا گنجان آباد علاقہ ہے۔ شام کے وقت یہاں ایک میلہ لگا رہتا ہے۔ ٹھٹھ کے ٹھٹھ ادھر ادھر کھڑے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بعض دکانوں کے آگے تختوں پر مستقل نشستیں ہوتی ہیں۔ چھمن کے بھی دو چار ملنے والے اس کی دکان پہ کبھی آ بیٹھتے تھے۔ وہ بوچاہتے گفتگو کرتے، مگر چھمن ہاں، ہوں، کے علاوہ اور کچھ نہ کہتا تھا۔ اسے کسی کی برائی بھلائی سے مطلب نہ تھا، آپ بھلے اور اپنا کام بھلا۔ جب کوئی کرید کر کسی کے بارے میں اس کے دل کی تھاہ لیتا تو وہ بڑی متانت سے اتنا کہتا تھا کہ میاں اچھے آدمی ہیں، ہم سے تو کبھی برائی کی نہیں۔ آگے بھگوان جانے۔ چھوٹے لوگوں کی زبان اکثر خراب ہوتی ہے، گالی دیئے بغیر کسی سے بات ہی نہیں کرتے اور دلی میں تو دشنام طرازی کا ایسا رواج ہے کہ دکاندار بات پیچھے کرتے ہیں اور گالی پہلے دیتے ہیں۔ چھمن کوئی فرشتہ تو تھا نہیں، کبھی کبھی لوگوں سے اس کی بھی کہن سن ہو جاتی تھی مگر شاباش اس کے تحمل کو ایسے وقت میں بھی اپنے آپ کو تھامے رہتا تھا اور زبان سے بیہودہ کلمات ہرگز نہ نکلتے تھے۔ اریب قریب کے لوگ بالآخر یہ سمجھ گئے تھے کہ چھمن ٹھنڈی مٹی کا بنا ہے لڑائی جھگڑائی کے مطلب کا نہیں ہے اس لئے سب اس کی عزت کرنے لگے تھے۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ حضرت عثمان ہارونی کو لوگوں نے، ان کے دشمنوں کے نرغے میں گھرا پایا، کم بخت آپ کو زدوکوب کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر لوگ ان پر ترس کھانے لگے۔ ایک بزرگ خدا رسیدہ بھی اس مجمع کے درمیان خاموش کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

انھوں نے لوگوں سے کہا کہ یہ شخص اگر چاہے تو اپنے دشمنوں کو اس زمین سمیت جس پر
وہ کھڑے ہیں، ابھی پلٹ سکتا ہے۔ سب کے منہ سے بے اختیار نکلا "پھر پلٹتا کیوں نہیں"۔
وہ فرمانے لگے اللہ اپنے جن بندوں کو طاقت اور اختیار سے نوازتا ہے انھیں صبر اور
قوتِ برداشت بھی اس سے زیادہ بخشتا ہے۔ جس شخص کو تم مار کھاتے دیکھ رہے ہو
وہ اپنے وقت کا قلندر ہے۔ اتنا کہہ کے وہ بزرگ اور حضرت عثمان ہارونی دونوں آنکھ
سے اوجھل ہو گئے۔

کلّو خواص کی حویلی کے پاس سے ابو ریشم والوں کا تعزیہ نکلتا تھا۔ دلّی میں
لوگ تعزیہ داری کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ محرم سے چار مہینے پہلے ہی کاریگر تعزیہ بنانا
شروع کر دیتے تھے اور کاغذ کی ایسی صناعی دکھاتے تھے کہ دیکھنے والے بس دیکھتے ہی
رہ جائیں۔ چاندی کے منقش کٹورے خوب جھمجھائے ہوئے اوپر سے نیچے تک ہر منزل
کے درمیان بڑی آب و تاب سے لٹکائے جاتے تھے اور ابو ریشم والوں کے تعزیے
پہ رنگین ریشم کے پھندنے زنجیکی کے ساتھ بل دیے ہوئے آویزاں ہوتے تھے کہ
سارا تعزیہ جگمگ کرتا تھا۔ پھر جب محرم کا چاند دکھائی دیتا اور سیدوں کی گلی سے
دھونسے کی آواز آتی تو تعزیے بنانے والے اپنے تعزیے گھر کے بیرونی دالان میں
لے آتے تھے تاکہ عقیدت مند آن کے اس کی زیارت کریں اور نذریں اپنی منتوں کی
اس کے قدموں میں رکھیں۔ نویں کی رات تک یہی گہما گہمی رہتی، کبھی جھنڈیاں نکلتیں
کبھی تعزیوں کو گشت کرایا جاتا، کبھی اعظم خاں کی حویلی میں براق سجتی اور شربت تو
جگہ جگہ سبیلوں پر دن رات بٹتا رہتا تھا۔ پینے والے سیر ہو جاتے مگر پلانے والے
نہ تھکتے تھے۔ چھٹن بھی محرم کی سات تاریخ کو پابندی سے ابو ریشم والے کے تعزیے

کی زیارت کرنے حاضر ہوتا تھا۔ سنا ہے ایک کٹورا چاندی کا نذرانہ بھینٹ بھی کرتا تھا اور دسویں تاریخ کے جلوس میں تعزیوں کے ساتھ ننگے سر اور ننگے پیر چلتے ہوئے تو اسے دلّی کے بچے بچے نے دیکھا تھا مگر اب شاید کسی کو یاد نہ ہو کیونکہ یہ کوئی عجیب بات تو تھی نہیں۔ تعزیوں کے ہمراہ دلّی کے سینکڑوں ہندو اسی طرح ہوتے تھے کہ ان کی پہچان کرنا بھی مشکل کام تھا۔ سچ پوچھئے تو پہچاننے کی ضرورت بھی کیا تھی، جو بویاں بوئے گا وہ آخرت میں کاٹے گا۔ نمائش اور دکھاوا تو تھا نہیں جیسا کہ اب رواج ہو گیا ہے۔ عرسوں، مذہبی رسومات اور تہواروں میں ہندو، مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ اب بھی شریک ہوتے ہیں، مگر وہ مولوی مدن کی سی بات کہاں ہے۔ دوسروں کے بزرگوں کا احترام تو اب والے کیا خاک کریں گے اپنوں کا تو کرتے نہیں۔ اچھا زمانہ بیت گیا۔ اب کلجگ آیا ہے دین دھرم کو ہندو مسلمان سبھوں نے اٹھا کر طاق پر رکھ دیا اور بس ہاؤ ہاؤ کئے جاتے ہیں کسی طرح پیٹ ہی نہیں بھرتے، ہوکا ہو گیا ہے، چھُتن کی زندگی میں ایسا وقت تھوڑی تھا، لوگ خدا اور رسول، پیر پیغمبر سب کو پہچانتے تھے جب اللہ نے یہ برکت بھی دی تھی کہ ادھی پاؤ بی جو کما لائے اس میں آرام سے گزارہ ہوتا تھا۔ سودے والے سیر کا سوا سیر تولتے تھے، ہر گھر میں آسائش تھی، اطمینان تھا اور لوگ آنند کے تار بجاتے تھے۔

چھُتن کی آمدنی ہی کیا ہوگی۔ بھڑ بھونجے بیچارے کا بھی کوئی کاروبار ہوتا ہے۔ وہ تو بس لوگوں کی خدمت کے لئے بیٹھا تھا۔ روکھی سوکھی جو ملتی وہ کھا لیتا ہوگا۔ پیٹ کا حال خدا ہی جانے اور پہننے اوڑھنے کی بابت میں نے آپ کو بتا ہی دیا کہ بس ایک لنگوٹ اور ایک بنڈی تھی مگر کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے سے کیا

ہوتا ہے آسودگی کسی اور شئے کا نام ہے وہ اگلے لوگوں کے مقدر میں لکھی تھی ہم اور آپ
تو عمر بھر کڑھنا لکھوا کر لائے ہیں۔ چھمن اپنی معمولی کمائی میں ایسا آسودہ اور اتنا مطمئن
دکھائی دیتا تھا کہ آج کوئی لکھ پتی بھی ویسا نظر نہیں آتا۔

چھمن بوڑھا ہو گیا تو اس کے بیٹوں نے اس سے کہا کہ وہ اب یہ کام چھوڑ
دے۔ اولاد خدا رکھے لائق ہوئی تھی۔ لڑکے اس کے کوئی اور دھندا کرتے تھے اور
کمائی بھی ان کی اچھی خاصی تھی۔ باپ کو بٹھا کر کھلا سکتے تھے مگر چھمن راضی نہ ہوا وہ چلتے
ہاتھ پیروں دنیا سے جانا چاہتا تھا اور جب اللہ اس کی محنت سے اسے روزی دیتا تھا
تو وہ کیوں آس تکتا، مرتے مر گیا پر دکان کھلی رہی۔ جب بند ہوئی تو ایسی بند ہوئی کہ
پھر دوبارہ چھمن کو دکان کھولنے کی مہلت ہی نہ ملی۔

مرتے وقت چھمن تین دن تک جان کنی کے عالم میں رہا۔ بڑی سخت تکلیف تھی۔
دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے کسی طرح جان ہی نہ نکلتی تھی۔ آخر پنڈت،
سیانے آئے، پہلے ہون کرتے رہے پھر نہ جانے کتنے منتر پڑھتے، جب ان سے کام نہ بنا تو
ان کہنی[1] کہلوائی اور اس کا کہنا تھا کہ چھمن کی روح قفسِ عنصری سے یوں پرواز کر گئی
جیسے پھول سے خوشبو نکل جاتی ہے۔

---

[1] ہندو لوگ کلمۂ طیبہ کو "ان کہنی" کہتے ہیں، نعوذ باللہ من ذالک۔

پائیں ہماریاں

سنا ہے دو پڑوسنیں بڑی لڑاکا تھیں۔ کام دھندے سے فارغ ہوتیں تو آمنے سامنے کھڑی ہوجاتیں۔ ایک کہتی "آؤ بہن لڑیں" دوسری جواب دیتی "لڑے میری جوتی" اور باقاعدہ لڑائی شروع ہوجاتی۔ کچھ یہی قاعدہ باتوں کا ہے۔ ملازمت کا روبار اور دیگر آلام روزگار سے فراغت پا کے جب ہم کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھتے ہیں تو بس باتوں کی بن آتی ہے۔ دوست احباب کہنیں یا نہ سنیں ہم شائق کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر بے تکان بولے جاتے ہیں۔ بحث شدہ موضوعات دوبارہ اٹھاتے ہیں اور اللہ کا نام لے کے پھر سے شروع ہوجاتے ہیں۔ ابھی میں نے کہا آپ نے سعادت حسن منٹو کو پڑھا ہے اور مد مقابل بڑی سنجیدگی سے جواب دیتے ہیں "بڑا واہیات آدمی تھا"۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ منٹو بے چارہ یوں قعر ذلت میں دھکیل دیا جائے اور آپ صرف ٹکر ٹکر دیکھا کریں۔ آپ نے تو موضوع

اٹھایا تھا آپ کا پہلا حق ہے۔ لہٰذا آپ نے جھٹ ایک طویل بحث کی طرح ڈالتے ہیں "وہ ایک فن کار تھا۔ اس کو تنگ نظر رجعت پسند طبقہ سمجھ ہی نہیں سکتا۔" لیجیے صاحب مورچہ تیار ہے۔ اب مجھے دیکھیے غالب کے اس شعر کی تفسیر نظر آتا ہے:

پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا ایک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

ایک دہریے ایک خدا پرست کی صحبت تھی۔ تھوڑی دیر خدا کے وجود اور عدم وجود پر بحث ہوتی اور رفتہ رفتہ بحث میں جاتی تھی، دونوں سرخ ہو جاتے آنکھوں سے لہو ٹپکنے لگتا مگر پائے استقامت کو ذرا جنبش نہ ہوتی۔ آخر کار جنبش ہوئی تو یہ نتیجہ نکلا، یہیں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا۔ بحث میں کیا نہیں ہوتا۔ غالب بیچارے معتوب قرار دیے جا سکتے ہیں۔ میر تقی میر پر سرقہ کا الزام آتا ہے۔ فدایانِ قوم طالب پرست ٹھہرائے جا سکتے ہیں اور زمانہ بڑے غور سے سنتا رہتا ہے "نتیجہ یہ ہے آپ کا حسن کرشمہ ساز ہے۔" بحث کا کوئی موضوع نہیں، بحث ہر بات پہ ہو سکتی، اس بات پہ بھی کہ بحث ہونی چاہیے یا نہیں)۔ ایک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں۔ آپ فرمائیں گے کہ ہر شخص بحث تھوڑی کرتا ہے یہ تو سرپھروں کا شیوہ ہے۔ بجا درست تیری آواز مکے اور مدینے، البتہ ذرا لگی لپٹی باتوں پر بھی نظر کیجیے۔ یہ ہوا بحث سے کہیں زیادہ مہمل ہوتی ہیں "آج بڑی گرمی ہے"۔ ایک ذات شریف نے کہا یہ بھی بات کہی گویا آپ تو محسوس کرنے کی صلاحیت کہاں رکھتے تھے۔ اور یہ کہ گرمی بس آج ہی تو ہے ایسی گرمی نہ پہلے کبھی تھی نہ قیامت تک ہو گی۔ اب آپ چپ رہیں تو آپ کی ذات کو بٹہ لگتا ہے۔ آسمان سے بجلیاں ٹوٹ پڑیں گی۔

رسمِ دنیا یہ ہے کہ اس موقع پر گرتے کو ہلا کے جسم کو مواد دیتے ہیں اور سراسیمگی کے عالم میں یوں گویا ہوتے ہیں: "سارے دن کڑی دھوپ پڑی ہے، بھبکا نکلا جاتا تھا!" سبحان اللہ کیا پر مغز تبصرہ ہے۔ بات یہیں ختم ہو جاتی تو بھی کچھ نہیں بگڑتا مگر افسوس تو یہ ہے کہ بات یہاں سے شروع ہوتی ہے

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھیرے گا

میر تقی میر لکھنؤ گئے تو ایک روز بازار سے گزرتے ہوئے نواب آصف الدولہ کے جلوس کا سامنا ہوا۔ نواب کے اشارے پر ایک مصاحب نے ان سے گفتگو کرنی چاہی مگر انھوں نے بڑی دماغی سے جواب دیا کہ شرفا راستے میں بات نہیں کرتے۔ آپ اور ہم بھی تو خدا کے فضل سے شریف آدمی ہیں۔ البتہ شرفا کی خو بو ہم میں کہاں پائی جاتی ہے۔ راہ چلتے کسی سے دو بدو ہو گئے اور ہم بہکنے لگے۔ زندگی کے قافلے کھڑے ہو جائیں یا آپ لوگوں کی آرجار میں خواص باختہ نظر آئیں سلسلۂ گفتگو جاری رہے گا۔ "حضرت آپ کے مزاج تو اچھے ہیں بہت دنوں سے غریب خانے پر تشریف نہیں لائے؟" پھر مزاج دریافت بڑی سنجیدگی سے جواب دیا گیا "میاں ہمارا اچھا اور برا کیا چراغِ سحری ہیں، چل چلاؤ کا وقت ہے آج ہیں کل نہیں۔"

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

اب اگر آپ بھلے آدمی ہیں تو فوراً کسی فلسفی کا قول دہرا سلام کر کے رخصت

ہو جائیں گے اور اگر خدا نخواستہ آپ کو بھی زبان دانی کا دعویٰ ہے تو علاج، معالجہ، وید حکیم سے لیکر بات کفن دفن اور سفر آخرت تک ضرور پہنچے گی۔

بات کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ غم سے دل ڈوبتا ہو کسی سے بات کیجیے دل ہلکا ہو جائے گا۔ آدمی آدمی کو بات چیت کے ذریعہ ہی دوست یا دشمن بناتا ہے۔ باتوں باتوں میں آپ کسی کے مزاج کی تندی یا نرمی کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے۔

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

میر کو اپنی اس شاعری پر گھمنڈ نہ تھا جسے وہ باتیں کرنا کہتے تھے۔

ع پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تک سر دھنیے گا

اور مصحفی غریب نے تو کسی کے نرم و نازک کلام پر جان و دل صدقے کئے تھے وہ باتوں کی جادوگری کے بھلا کیوں نہ قائل ہوتے۔

یاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ اُدھر زلف اُڑا لے گئی دل کو

غالب نے محبوب کو باتوں باتوں میں راہ پر لائے تھے اور داغ نے محبوب کی کمسنی کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

بات کرنی بھی نہ آتی تھی تمہیں
یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر چھپا رہنا کون سا عیب ہے جو ہم ہمہ وقت

بے موقعہ بولے ہی جاتے ہیں۔ دو آدمی خاموش بیٹھے ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے دو فرشتے بیٹھے ہوں۔ ایک دوسرے سے بے نیاز اپنے اپنے کام میں مصروف۔ لیکن ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ خواہ جان پہچان مطلق نہ ہو، مگر جہاں دو حیوان ناطق سامنے آئے اور گفتگو نے وجود پایا۔ غریب کی انگنائی ہو یا رئیس کا دیوان خانہ، بات کے رسیا بلا انتہا ہر جگہ بولے ہی جاتے ہیں۔

فرض کیجیے آپ ریل میں بیٹھے ہیں اور باہر کے مناظر بڑے خوبصورت ہیں انھیں دیکھے جایئے یہ کیا ضروری ہے کہ برابر والے مسافر سے کہنی بھی ماری جائے۔ یہ کہنے کے لئے کہ وہ بھی آپ کے ساتھ نظارہ کرے اور نہ صرف یہ کہ دیکھے بلکہ آپ کے ارشادات پر تحسین و آفریں بھی کہے گویا آپ کی نگاہ سے دیکھے "یہ کھیت کتنا خوبصورت ہے" واہ واہ! اور پہاڑ دیکھتے ہیں، کیا دُور تک بل کھاتے چلے گئے ہیں۔" اتنے میں کوئی شہر آئے تو اس کی تاریخ یہ بات ہو۔ آپ پوچھیں گے انھوں نے وہ شہر دیکھا یا نہیں، اور اس کے جواب میں وہ اپنی سیر و سیاحت کا پورا دفتر کھول بیٹھیں گے تو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔

یوں تو ہر بات تھوڑا بہت نمک مرچ لگا کے بیان کی جاتی ہے مگر گفتگو کا ایک خاص موضوع ایسا بھی ہے جس میں مبالغہ کی بے پناہ گنجائش ہے۔ بیتے دنوں کی یادیں، قصۂ یاران کہن، یہ سدا بہار موضوع ازل سے چلا آتا ہے اور اس کا دامن، دامن قیامت سے بندھا ہے۔ بوڑھے ہو کر آپ اپنے زمانے میں مگن ہو جایئے، کس کی مجال ہے کہ ماننے میں پس و پیش کرے آخر آپ

بھی تو اپنے بزرگوں کی بات بڑے تحمل سے سنتے آئے ہیں۔ بزرگ بے چاروں
کی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے بعد بھی سینہ کوبی کے لئے زندہ رہ جاتے
ہیں۔ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ۔

گفتگو کا ایک اور نازک پہلو ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کسی تاجر کے پاس
بیٹھے ہوں تو تمام گفتگو کے دوران کچھ اس طرح سنئے گا جیسے آپ بہ نفس نفیس کھاری
باؤلی یا صدر بازار میں گھومتے ہوں۔ اشیا کی گرانی اور بازار کے اتار چڑھاؤ میں کل
کائنات سمٹ آئے گی۔ وکیل صاحب زندگی کی کھلی حقیقتوں کو بھی دلیل کے بغیر
ماننے سے انکار کردیں گے۔ سرکاری ملازمین کے پاس ہر بات پہنچے با ضابطہ پہنچنی چاہیے
اور ڈاکٹروں کا نقطۂ نظر ہمیشہ صحت مند ہونا ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار
فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست

بات کا یہ سلسلہ کب اور کیسے شروع ہوا۔ یہ ایک تحقیق طلب معاملہ ہے البتہ آج اس کی
ترقی کا یہ عالم ہے کہ ہم بغیر کسی مقصد کے گھنٹوں بول سکتے ہیں۔ اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا
اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم زبان سے جو کچھ کہتے ہیں حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔
فرض کیجئے آپ کے گھر بے وقت مہمان آجائیں آپ فرمائیں گے کہ آپ کو ان کے تشریف
لانے پر بڑی مسرت ہوئی حالانکہ آپ دل ہی دل میں ان کی جان کو دعائیں دے رہے ہیں۔
ہم سب ایک دوسرے کے مزاج پوچھتے ہیں۔ تکلفات میں ایسے ایسے جملے کہے جاتے ہیں
کہ اگر ہم ان کہا ہمارے سر پڑ جائے تو چودہ طبق روشن ہو جائیں۔ ایسی ہی کسی موقعے
تماشہ ہو کے غالب نے کہا تھا:

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔ باتوں کی لذت نے انسان کو ایسا مسخر کر لیا ہے کہ آدمی ہر تکلیف، بیماری سہہ سکتا ہے مگر خاموش رہ کے جینا اسے بالکل گوارا نہیں۔ اب ہمیں کو دیکھیے ابتدا اس کی تھی کہ بات کرنا سراسر مہمل ہے اور انتہا یہ کہ خود مرے سے مرے کی باتیں کئے جاتے ہیں، بہر کیف اس اعتراف جرم کے بعد ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔

ہاتھ

کسی کی نرم و نازک، حسین، مرمریں ہاتھوں کا ذکر نہیں، جنھوں نے
اُردو شاعری کی آبرو بڑھائی ہے، میں ان ہاتھوں کا ذکر کرتا ہوں جو مشقت
مقرری کے باعث زبانِ حال سے فریاد کرتے ہیں: انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں
اپنا۔ وہ ہاتھ جن کی بدولت انسان ایک چوپائے سے تمام نہاد ترقی یافتہ مخلوق
بن گیا، وہ ہاتھ جنھوں نے ایلورا، اجنتا کے بُت تراشے، اہرام مصر بنائے،
اور شاہجہاں کے حسین خواب کو تاج محل کا روپ بخشا، وہ ہاتھ جو دھرتی کی
کوکھ چیر کر سونا نکالتے ہیں۔ ہاتھ مصروفِ کار رہیں تو کائنات سنورتی ہے۔ ہاتھ برسرِ
پیکار آئیں تو انسانیت کا لباس تار تار ہوتا ہے، اٹھیں ہتھیار بنتے ہیں، آدمیت
لہو روتی ہے۔ اور ہاتھ بے مصرف ہو جائیں تو شخصیت بوجھل نظر آتی ہے۔
کاندھے جھکنے لگتے ہیں اور آدمی زندگی سے بے زار ہو جاتا ہے۔ پھر دستِ سوال

درانہ ہوتا ہے، بندگی کے آداب اٹھ جاتے ہیں اور وہ آدمی جسے میسّر نہیں انساں ہونا، توبہ توبہ خدا بن جاتا ہے۔

ہاتھ کی داستان بڑی طویل ہے۔ پتھر کے زمانے سے اب تک دور تک ہاتھ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ شمشیر و سناں سے طاؤس و رباب تک کل جلوہ گری انھیں ہاتھوں کی ہے۔ کبھی ہاتھ سرہانے دھر سے دھرے ہو گئے تو قلندری کا نمود ہوا۔ تو میں طاق پہ ہاتھ دھر کے بیٹھیں تو ایک نوا سے سروش کانوں میں آئی۔

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

کبھی دستِ جنوں کے حوصلے سامنے آئے، دستِ طمع کی ستم ظریفیاں دیکھیں۔ دستِ صبا گیسوئے جاناں سے اٹکھیلیاں کرتا گزر گیا، اور کبھی دستِ خرد کے ہاتھوں رسوائے دہر ہو کر چالاکیاں سیکھیں۔ غرض انسانی تاریخ کا ہر صفحہ انھیں ہاتھوں کی شوخیوں کا افسانہ سناتا ہے، جہاں یار کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا۔

یاد ش بخیر! ایک زمانہ تھا کہ انسان ہاتھوں کے موجودہ استعمال سے بالکل ناواقف تھا۔ یقیناً اُس وقت ہاتھ پاؤں کا کام دیتے ہوں گے، پھر نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے اپنے سارے وجود کا بوجھ محض پاؤں پر ڈال دیا۔ شخصیت کے حسن میں اضافہ ہوا یا فائدہ اس سے بحث نہیں۔ البتہ ہاتھ اسی روز سے عضوِ معطّل بن کر رہ گئے ان ہاتھوں میں انسان نے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور اپنے قریب ترین دوست کے سر پہ دے مارا۔ قابیل کی اس بہیمانہ حرکت نے

ہاتھ کی فطرت اور مستقبل انسانی ذہن پر روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیے، مگر افسوس! کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے۔ انسان نامراد اس اشارے کی تہہ کو نہ پہنچا اور پیہم اپنے خالی اور بے مصرف ہاتھوں کو بھرنے کی فکر میں لگا رہا۔ چھڑی۔ ڈنڈا، تیغ، خنجر اور بھالے ایجاد ہوئے۔ ہاتھ تلوار بن کر گلا کاٹنے لگا اور ہاتھوں نے ڈھال بن کر انھیں روک بھی لیا۔ ہاتھ نے دروپدی کا لباس چھینا، ہاتھ نے کربلا کی زمین پر فساد برپا کیا اور ہاتھ نے ہی دجلے کی مانگ میں سیندور بھر دیا۔ وقت کوتاہ، قصہ طولانی۔ جب انسان کو اپنے ہاتھ پر زعم نہیں تھا تو آسمان سے من و سلویٰ اترتا تھا پھر اس نے ہاتھ سے مٹی کو سونا بنایا۔ زمین اناج اگلنے لگی، انسان دو فرقوں میں بٹ گیا۔ سرمایہ دار اور غریب، برہمن اور اچھوت۔ تفریق کی اس دیوار نے ہزاروں مسائل پیدا کر دیے، ہاتھ نے قلم پکڑا اور ان سب کا حل ڈھونڈنے لگا۔ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ، ہاتھ نے افسانے لکھے، داستانیں گھڑیں، حسین شعر رقم کیے، پتھروں میں حسن تراش کیا، موقلم سے جادو جگائے، رباب پر نغمے چھیڑے اور سارے جہان کو لوریاں دے کر سلا دیا۔ یہاں تک جائیے زندگی کی نبض ہاتھ کے قریب دھڑکتی نظر آئے گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانیت ہاتھوں کی خدمات سے محروم رہتی تو کیا ہوتا؟ میں کہتا ہوں سورج اسی آب و تاب سے نکلتا، چاند کی نقرئی کرنیں انسانی دلوں میں رومانیت کی جوت جگاتیں اور یہ چرخِ نیلی فام یونہی سرنگوں پر سایہ کیے رہتا فرق صرف اتنا ہوتا کہ انسان کی انا تشنہ کام رہ جاتی وہ "تو شب آفریدی چراغ آفریدم" کا نعرہ بلند کر کے یہ نہ کہہ پاتا کہ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر،

ہاتھ سب کچھ نظر آتے ہیں اور ہاتھ کچھ بھی نہیں۔ ایک بے معنی چیز ایک دائمی مصیبت جس نے سہل اور سادہ انسانی زندگی کو پیچیدہ گورکھ دھندا بنا دیا "ہمیں کو اب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" ذرا غور تو کیجیے انسانی ہاتھوں نے کائنات کی کتنی گتھیاں سلجھائی ہیں اور کہاں کہاں ہم" "دستِ کوتاہ تا سبو نہ گیا" کہہ کر رہ گئے۔ سنا ہے ہاتھوں نے فطرت کو مسخر کر لیا ہے۔ کیا ہوگا، بجلیاں تو اب بھی گرتی ہیں۔ بھونچال تو اب بھی آتے ہیں۔ یہ کیا مذاق ہے۔ سنا ہے ہاتھوں نے کائنات کو حسن بخشا ہے، ندی کو جلترنگ سکھائی ہوگی، شفق میں رنگ بھرا ہوگا، ستاروں کو روشنی بخشی ہوگی، خوب! انسان اشرف المخلوقات ہے یہ کون کہتا ہے؟۔ انسان نے ہاتھوں نے دنیا کو سنوارا، یہ دعویٰ کس کا ہے؟ ہاتھوں کا!

فطرت تمام حسنِ خود آرا کی ہے مثال
کن انگلیوں نے رات کی زلفیں سنواریاں

انسان کا قاعدہ ہے کہ جسے چڑھاتا ہے فلک الافلاک تک چڑھا دیتا ہے اور جسے گراتا ہے پاتال میں لے جاتا ہے۔ ہاتھوں کی تعریف و توصیف بہت ہو چکی اور نتیجہ یہ نکلا کہ خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد۔ آئیے اب ذرا ہاتھوں کی بے بسی پر غور کریں۔ سارے جسم سے الگ دو مجہول اعضا ہاتھ کہلاتے ہیں۔ سوتے میں ذرا کروٹ لیجیے تو یہ مخل ہوں، چلنے میں ان پر توجہ کم ہوئی اور یہ کسی شریف آدمی سے جا ٹکرائے، اچھی بری جگہ پڑے۔ بیٹھیے تو انھیں کہاں رکھیے، بڑی مشکل سے قابو میں آتے ہیں۔ ناک پر ٹکاؤ تو مضحکہ خیز بن جاؤ، سر پر پھیلاؤ تو آخر کب تک۔ خالی خالی برے لگیں اور انھیں چھڑی یا بید سے آراستہ

کیجیے تو رعونت پیدا ہو، شخصیت کا لطیف ترین پہلو مارا جائے۔" نہیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے" محبوب سے ملاقات کا وقت ہے تو یہ درمیان میں حائل۔ محبوب انھیں دوپٹے کے آنچل میں لپیٹتا ہے تو آپ بے چارے انھیں سینے پر باندھ دست بستہ کھڑے ہو جاتے ہیں یا اس نے آتے ہی اپنے دستِ احمریں آپ کے گلے میں حائل کر دیے تو آپ اپنے ہاتھوں سے کیا کریں۔ دست درازیاں؟ چلیے یونہی سہی۔ "دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے" مگر اس کا انجام کیا ہوگا۔ رسوائی، بے توقیری اور پشیمانی۔ عزتِ سادات جائے گی اور آپ یوں گنگنائیں گے:

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

آپ نے کسی بڑے آدمی کا سامنا کیا ہے۔ میرا مطلب ہے انٹرویو میں۔ اس وقت پاؤں تو کانپنے لگتے ہیں، ہل ہل کر شخصیت کو سہارا دیتے ہیں، مگر ہاتھ بہت بڑا بوجھ بن جاتے ہیں۔ بار بار گریبان پر جا کے بٹنوں سے کھیلنے لگتے ہیں، کف درست کرتے ہیں، کالر سنبھالتے ہیں اور جب کچھ بس نہیں چلتا تو موت بن کر سر پر منڈلانے لگتے ہیں۔ میرا خیال ہے اگر ہاتھ ملاقات کے کمرے سے باہر رہ جائیں تو شخصیت کا تاثر دو چند ہو جائے۔ مشہور یونانی دیوتا وینس کے ہاتھ نہیں ہیں۔ شیطان نے ہاتھ کی بے بضاعتی پر بڑا تیکھا طنز کیا ہے:

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا

میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو

ہم ہندوستانی بات کرتے ہیں تو ہاتھ نچاتے ہیں، لفظوں کو جھیلتے ہیں۔ گویا

ہماری زبان ہمارے مافی الضمیر کے اظہار سے قاصر ہے بحث کرتے ہیں تو سامنے
رکھی ہوئی میز کی شامت آجاتی ہے رقص کرتے ہیں تو ہاتھ کبھی کولہے پر ٹکاتے ہیں اور کبھی
کمر کے پیچھے چھپا لیتے ہیں۔ اچھی مصیبت ہے پاؤں تھرکتے ہیں کمالات دکھاتے ہیں
اور ہاتھ بیہودہ ساتھ لگے رہتے ہیں۔

ہاتھوں میں رومال یا سگریٹ نہ ہو تو ہاتھوں کی پریشانی دیکھئے آپ
اپنا ماتم کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس قوم نے ہاتھوں سے نباہ کرنا سیکھ
لیا وہ ترقی کی معراج کو پہونچ گئی۔

مغرب نے ہاتھ کے لیے بڑی بڑی ترکیبیں بنائیں۔ پائپ، پورٹ
فولیو، سگریٹ اور ہینڈ بیگ ایجاد کیے مگر گزشتہ صدیوں کی مسخر انگیز حرکتیں ہاتھ
اپنے بے ہنگم وجود کے اعلان سے باز نہ آسکے۔ اختیار ایک ادا تھی مری مجبوری کی۔
دیوانگی کی حالت میں جب آپ اپنے درجہ دست سے بے نیاز محض ہو کر جیب
داماں کی فکر چھوڑ دیتے ہیں تو بھی ہاتھ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتے تار آستین بن
کے زرک پہونچائے جاتے ہیں۔ اپنے ستمگر مزاد ہے اس آشفتہ سری کا۔ غالب نے
ہاتھوں کی کارگزاری پہ کیا خوب تبصرہ کیا ہے۔

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے داماں کو

ہاتھ کی بات چلی ہے تو ہاتھ ملانے کا تذکرہ بھی ہو جائے۔ صبح سے شام تک ہر زندہ
آدمی کے ہاتھ میں کم از کم سو ڈیڑھ سو ہاتھ آتے ہوں گے۔ نرم و نازک ہاتھ۔ سخت
اور کھردرے ہاتھ۔ کانپتے ہاتھ، پسیلے ہاتھ، گندے سڑے گرے ہاتھ۔ بیہودہ ہاتھ جو ہاتھ پر اپنا

چہرے پر چھوڑ جائیں۔ ایسے ہاتھ جن کا لمس دُنیا سے جی اُچاٹ کر دے اور ایسے ہاتھ
جن ہیں ہاتھ دیکھے عمر بھر پچھتانا پڑے۔ آپ خواہ کسی سے نفرت کریں یا محبت، یہ
آپ کا ذاتی فعل ہے، مگر سوسائٹی کا تقاضا یہ ہے کہ ہاتھ سب سے ملائے جائیں۔
حریف سیاستدان ہاتھ ملاتے ہیں، ایکدوسرے کے مقابل پہلوان ہاتھ ملاتے ہیں، دوست ہاتھ ملاتے
ہیں، دشمن ہاتھ ملاتے ہیں۔ غرض ہاتھ نہ ہوئے ایک آفت ہوئے کہ جو آئے ان میں
اٹک جائے۔

ہاتھ دکھانے کی صنعت، وہ نہیں جو کسی کو انگوٹھا دکھاتے ہوئے دکھائے جاتے
ہیں بلکہ وہ جو قسمت کا حال معلوم کرنے کے لیے دکھائے جاتے ہیں۔ ایک مشتبہ
آدمی کسی نجومی کے پاس پہونچ آزمائش کے لیے سوال کیا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ میرے
کتنے بچے ہیں" "جواب ملا "دو" وہ ہنس کر کہنے لگے "جھوٹ! میرے تو تین بچے ہیں"
نجومی نے سنجیدگی سے جواب دیا "یہ تو آپ کا خیال ہے ورنہ علم تو دو ہی بتاتا ہے"
ان بیچاروں کا بیٹھے بٹھائے گھر اجڑ گیا اور وجہ دیکھیے تو وہی ہاتھ جس کی کانٹھ۔
نابوکس نے تیرے صبیدہ چھوڑ آزمانے میں ذرا ایک اور پہلو پر غور کیجیے، ہاتھ خدمت گار
نہ ہوتے تو کیا انسان ہاتھ کا محتاج رہتا۔ تو بہ کیجیے "ہر وقت آدم خاک سے انجم سہمے جاتے
ہیں" یہ مشت غبار قریب قریب تسخیر کون و مکان کی منزل کو پہونچ گیا ہے، البتہ انہیں ہاتھوں
نے آسمان تیر تفنگ، مشین اور دوسرے دستی ہتھیاروں یا اوزاروں کا طول طویل
دور گزرنے پر مجبور کیا۔ آج آدمی محض اشاریت سے کام لیتا ہے اسے ہاتھ ہلانے
کی مطلق ضرورت نہیں، فقط ابرو کے اشارے سے کام لیتا ہے، ہاتھ نہ ہوتے تو یہ سعادت
کب کی نصیب ہو گئی ہوتی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے اور ایجاد انسان کی سرشت۔

ہاتھ پہ تکیہ کر کے انسان پانچ ہزار برس تک سوتا رہا اور ایک ایسی تہذیب کو فروغ دیا جس کے لیے اقبال نے پیشن گوئی کی ہے:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

کسی بھوت کی چوٹی کاٹ لیجیے، وہ بھیسنہ بن جائے گا۔ ہر گھڑی ہاتھ باندھے حکم کا منتظر رہے گا، اور اگر حکم نہ دیجیے تو جان لینے کو تیار۔ ہاتھ بھی ہمارے لیے بھوت سے کم نہیں، جان لینے کے درپے ہو گئے ہیں۔

کہتے ہیں خدا نے لیکھ کے منہ میں بال دے دیے ورنہ وہ تمام سر کھا جاتی۔ انسان ہاتھ سے تو اب پیچھا چھڑا نہیں سکتا۔ خود کردہ را نیست علاج البتہ ہاتھ کا بلاواسطہ بائیکاٹ کر سکتا ہے۔ ہاتھ کو پھر سے معطل کر دیجیے اور دیکھیے کہ انسان کے دُکھ دُور ہوتے ہیں یا نہیں۔ زندگی کی تمام برکتیں جو ہاتھ کے باعث ہمارے ہاتھ نہیں آتیں ایک بار پھر قدموں پہ آ پڑیں گی۔

"ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں"

میزبان نوازی

شہنشاہ اکبر نے ایک روز بیربل سے کہا۔ ”جن لوگوں کے نام کے ساتھ ”بان“ لگا ہوتا ہے وہ عموماً اچھے آدمی نہیں ہوتے، جیسے دربان، فیل بان، گاڑی بان وغیرہ۔“ بیربل نے برجستہ جواب دیا۔ ”جی ہاں مہربان!“ اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکبر نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ آپ کہیں گے ثبوت! تو جناب حضرتِ دربان کی نوازشوں کا ذکر دیکھنا ہو تو اُردو شاعری کا مطالعہ کیجئے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے (غالبؔ)

فیلبان اور گاڑیبان سے جنہیں واسطہ پڑا ہے وہ خود جانتے ہوں گے۔ البتہ اسی قبیلے کے دو افراد یعنی مہربان اور میزبان سے ہماری ملاقات بھی اکثر ہوتی رہتی ہے اور سچ پوچھئے تو ہمیں اکبر کی بات سے ذرہ برابر اختلاف نہیں۔ مہربان اور

میزبان میں معمولی سا فرق ہے۔ میزبان ہر وقت مہربان رہتے ہیں اور مہربان کسی بھی وقت میزبان ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اس وقت اپنے مہربانوں کا ذکر تو مقصود نہیں اور نہ ہی ہم ان کی مہربانی سے محروم ہونا چاہتے ہیں۔ البتہ میزبانوں کے لئے ضرور چند کلمۂ خیر حسن لیجئے۔

ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ ہم ہفتہ میں آٹھ دن کسی نہ کسی کے مہمان ہوتے ہیں اس لئے نہیں کہ ہم خدانخواستہ ندیدے یا مفت خورے ہیں بلکہ اس لئے کہ ہم ایک اچھا مہمان ہونے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک پان کھلایئے اور ہمارے قریب ترین دوست کی غیبت فرمایئے۔ کم از کم جب تک وہ پان کلّے میں دبا ہے ہماری جبیں پر بل تک نہ آئے گا۔ لوگ کہتے ہیں یہ اچھی بات نہیں مگر ہم کہتے ہیں اس میں برائی ہی کیا ہے یہ تو لازمۂ انسانیت ہے اخلاق کی سب سے بڑی قدر ہے۔ جس کا کھایئے اس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا گایئے اور اگر آپ یہ نہیں کہہ سکتے" تو معاف کیجئے آپ نے میزبان نوازی میں کوتاہی کی ہے۔ آپ کہیں گے میزبان نوازی کیا؟ تو سنیئے۔ کسی بھلے مانس نے آپ کو لنچ، ڈنر یا چائے پر بلایا آپ خود ہی سوچئے کہ اس گرانی کے دور میں اس نے کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ بس اب احسان شناسی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ہر بات برضا و رغبت سنیئے۔ دستر خوان پر بیٹھئے تو اس کے لوازمات پر ایک تقریر دلپذیر کیجئے۔ اور چلتے وقت ایسی نگاہ تشکر آمیز سے دیکھئے کہ حق طعام ادا ہو جائے۔ ورنہ آپ بدتمیز آپ کے اجداد بدتمیز۔

خدا جھوٹ نہ بلائے ہم نے ہزاروں بار خودکشی کر کے میزبان کو زندگی بخشی ہے۔ کھٹیا سگریٹ پی کر دانت بھر کھائے ہیں۔ جون کی العطش گرمی میں سیاہ کافی

کے ہر گھونٹ پر بڑا لمبا قصیدہ پڑھا ہے۔ سگرین کی آئس کریم کھا کے بھیر دیں میں باتیں کی ہیں۔ نزلے اور زکام کی حالت میں ٹھنڈے تخ مشروبات پئے ہیں۔ بے نمک کھانا کھایا ہے۔ پھٹے دودھ کی چائے پی ہے اور ان سب کے باوجود دل زار کی حالت کو میزبان سے چھپایا ہے ع

کوئی حد بھی ہے آخر احساس آدمیت کی

ہمارے ایک مہربان ہیں انھیں پان میں زردہ کھانے کی عادت ہے لکھنؤ سے قوام منگاتے ہیں اور اللہ کے بندے سیر دل کھا جاتے ہیں۔ جب کبھی ہماری شامت آجاتی ہے اور ہم ان کے گھر کا رخ کرتے ہیں تو ہم پر بھی کرم ہوتا ہے۔ ان بزرگوار کے مجبور کرنے پر ہم یہ سریع الاثر زہر کھا تو لیتے ہیں مگر اس کے کیا ہوتا ہے یہ بتانا مشکل ہے ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

کوئی بیمار غم ہو تو دو ہچکیوں میں فیصلہ ہو جائے مگر ہم تو گھنٹوں جاں کنی کے عالم میں رہتے ہیں اور میزبان صاحب ہیں کہ قہقہہ پر قہقہہ۔ زردہ نہ پچنے پر طعن و تعریض۔ ظالم مارے اور رونے نہ دے۔ ہماری شرافت دیکھئے کہ ہچکیوں کا کوئی اور بہانہ بنا کے ان کے خاطر عاطر پہ ملال تک نہیں آنے دیتے ؏

دل بدست آور کہ حج اکبر است

ہر بلا ٹل سکتی ہے مگر میزبان سے بچ کے آدمی کہاں جائے۔ ان کا کوئی ٹھکانہ تو ہے نہیں۔ راہ چلتے ملاقات ہو جاتی ہے اور پھر جو آدمی جائے بہانے اس راہ میں کتراؤ

آپ دفتر جاتے ہوں، کسی کا انتظار ہو، بیمار کی عیادت منظور ہو، سفر کا ارادہ رکھتے ہوں یا کوئی اور ضروری کام۔ جناب میزبان آپ کا راستہ روکیں گے اور پھر معذرت کرنا ان کی آتشِ شوق کو ہوا دینا ہے وہ چاہے زہر کھلائیں آپ کو انکار کی اجازت نہیں ؎

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

میزبان کی مہربانیوں کا دفتر کھلا ہے تو جی چاہتا ہے کہ ان کی تعریف میں پوری الف لیلیٰ رقم کی جائے مگر صاحب ؎ قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل۔

رات تھوڑی ہے اور سوانگ بہت، اس لئے محض ایک واقعہ سُن لیجئے:

ہمارے ایک عزیز چند روز پہلے وارد ہوئے۔ فرمایا "آج شام کا کھانا غریب خانے پر تناول فرمائیں"۔ ہم نے خوبصورت جھوٹ بولا "معاف کیجئے ہمیں آج تو اپنے ہمزلف کے یہاں جانا ہے"۔ وہ کب ماننے والے تھے، دوسرے دن کے لئے مدعو کیا۔ ہم نے پھر پہلو بچایا۔ مگر صاحب مختصر یہ کہ آخر قبول کرتے ہی بنی۔ دعوت میں پہنچے تو انھیں بے چین و مضطرب پایا۔ کچھ دیر تک صحت، موسم، معاشیات اور سیاست پر گفتگو ہوتی رہی اور کچھ پڑوسیوں کی غیبت ہوئی۔ دوستوں کی مہربانیوں کا ذکر آیا۔ عزیزوں کی تغافل شعاری کے رونے روئے گئے۔ ہمیں یقین کیجئے، ان کی ایک بات سے بھی اتفاق نہ تھا۔ اور ہوتا بھی کیسے معتوب لوگوں میں ہم خود بھی شامل تھے، مگر اختلاف کر کے انھیں بدمزہ کرنا ہماری سرشت کے خلاف تھا ؎

یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت کہاں مجھے

سوچا اگر کچھ کہیں گے تو ناحق ان بے چاروں کی دل آزاری ہو گی میر کا یہ شعر تحت الشعور سے ابھرنے لگا ؎

مت رنجہ کر کسو کو کہ اپنا تو اعتقاد
دل ڈھائے کے جو کعبہ بنایا تو کیا کیا

آخر صبر کر کے خاموش بیٹھے رہے۔ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔ انھوں نے جو دیکھا کہ ہم سا بے زبان زیرِ دام آیا تو خوب ہی جلے پھپھولے پھوڑے۔ ایک اپنے آپ کو چھوڑ سارے جہان میں کیڑے ڈالے۔ غرض یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ ہم بھوک سے نیم جان ہو گئے۔ ناک کا بانسہ پھرنے لگا۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں تو انھوں نے خاصہ لگانے کا حکم دیا۔ اب جو ایک طائرانہ نظر دسترخوان پر ڈالی تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میزبان نے جو کچھ پکوایا تھا وہی ہماری جڑ تھا۔ بھوک کا یہ عالم کہ اب لگی کہ پھر نہ لگے گی اور دل کا یہ کہنا کہ ایک ان‌شاءاللہ جان جائے یا رہے پر کسی شئے کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں۔ آخر دلِ خانہ خراب کو بہلایا۔ طوعاً و کرہاً لاالہ توڑا۔ میزبان نوازی کے پیش نظر کھانوں کی شان میں قصیدے کہے۔ جھوٹ موٹ چٹخارے لئے بار بار ہاتھ کھینچ کے طبیعت سیر ہو جانے کا یقین دلایا تب کہیں جان کو امان ملی ؎

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

ہم نے میزبان کے ہاتھوں قدم قدم پر زک اٹھائی ہے مگر اس کے باوجود ہم ہیں کہ اپنی وضعداری نباہے جاتے ہیں۔ بھلا آپ ہی بتائیے۔ اصرار اور پیہم اصرار کے باوجود انسان کہاں تک ٹال سکتا ہے ہم مروت کے بندے ہیں

کسی بات پر ضد کرنا ہمارے مسلک میں کفر ہے۔ لہٰذا یہ سوچا ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو میزبان نوازی کا یہ سلسلہ مرتے دم تک جاری رہے گا ؎

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا
(غالبؔ)

▲

شکّی بیوی

سُنا ہے جب خدا نے آدم کو پیدا کیا اور ان کے رہنے کے لئے ایک حسین جنت بنائی تو کچھ دن بعد آدمؑ کا جی تنہائی سے گھبرانے لگا۔ پھر ان کی بائیں پسلی سے حوّا کی پیدائش ہوئی اور آدم و حوّا دونوں ہنسی خوشی جنّت کے باغوں میں رہنے لگے۔ حوّا بہرحال ایک عورت تھیں ان کے دل میں شک کا پیدا ہونا بھی ضروری تھا۔ اس لئے وہ روزانہ آدم کی پسلیوں کو بغور گن لیتیں، تب کہیں جاکر انھیں اطمینان ہوتا تھا۔ پسلیاں گننے کا یہ رواج زمان و مکان کی تبدیلیوں کے ساتھ حوّا کی نسل میں آج بھی جاری ہے۔ آپ خواہ کتنے ہی بھلے مانس اور نیک دل شوہر ہوں، آپ کی اہلیہ اس حقیقت کو مشکل ہی سے تسلیم کریں گی۔ مثل مشہور ہے جو ینده یابنده، انھیں خیر سے کچھ ایسے شواہد بھی مل جائیں گے جن کی روشنی میں ان کا وہم ایمان و ایقان کی منزل کو جا پہنچے گا۔ پھر اگر آپ چاہیں کہ اپنی صفائی میں کچھ عرض

کریں تو اس کا موقعہ ہی نہیں دیا جائے گا اور اگر موقعہ دیا بھی جائے تو کیا آپ یہ
سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کی بات کا یقین کریں گی۔ تو یہ کیجیے عورت کے دل میں محبت، نفرت،
شک، شبہ جو بھی جگہ پا جائے وہ اٹل ہوتا ہے۔

جو نکل گیا زبان سے وہ نکل گیا زباں سے

کسی محترمہ نے ایک دن اپنے شوہر کے کوٹ پر ایک لمبا سا بال دیکھ لیا
اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرض کیا کہ شوہر کے کاندھے پر غیر کی زلف کا سایہ پڑا ہے۔
پس پھر کیا تھا وہ بغور اس کے لباس کا معائنہ کرنے لگیں اور جب مزید کوئی ثبوت
برآمد نہ ہوا تو اس اتفاق کو درگزر کرنے کی بجائے انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ شوہر
کی محبوبہ نے پکڑے جانے کے خوف سے چندیا ہی صاف کرا دی ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے اسد

بیوی آپ کے قریب رہ کر بھی آپ کی ذاتی پریشانیوں سے بے خبر رہ سکتی ہے
آپ کی مالی مشکلات کا اسے علم ہو تو وہ دانستہ تغافل برتے گی۔ لباس کے ادھڑے
ہوئے ٹانکے اور شیروانی کے ٹوٹے ہوئے بٹن اس کی نظر سے مدتوں پوشیدہ
رہیں گے۔ آپ کی خاندانی ذمہ داریوں کو وہ جان کر بھی انجان بن جائے گی لیکن
آپ کے جذباتی رشتوں اور تفریحی مشاغل کا کوئی گوشہ اس کی نظر سے چھپ
نہیں سکتا۔

جو نگاہ اٹھتی نہیں کبھی وہ نگاہ جاتی ہے چار سو

آپ نے کب اور کس موقعہ پر گھر کی نوکرانی کو نظر بھر کے دیکھا تھا۔ آپ کے
کتنے دوست ایسے ہیں جو بیوی کی نظر میں قابل اعتبار نہیں۔ آپ دفتر سے گھر

آتے ہوئے کہاں کہاں رُکتے ہیں۔ آپ کے ساتھ کتنی عورتیں کام کرتی ہیں ان میں
کس کس کی شادی ہوئی ہے اور کون ابھی کنواری ہے۔ کس کے شوہر جوانی میں داغِ
مفارقت دے گئے تھے۔ یہ سب بیوی کے تحقیقی موضوع ہیں۔ کبھی وہ آپ کی جیب سے
دو ٹکٹ سینما کے برآمد کرے گی اور اس پر مدلل بحث ہوگی۔ کبھی اسے باوثوق ذرائع
سے پتہ چلے گا کہ آپ نے ایمپوریم سے ایک ساڑھی خریدی ہے۔ کبھی اس کی کوئی
سہیلی بتا دے گی کہ آپ اس کے آگے سے مسکراتے ہوئے گزرے تھے۔ کبھی آپ
کے پرس کو مہینہ کی درمیانی تاریخوں میں خالی پاکر وہ آپ پر فضول خرچی اور اس سے
متعلقہ الزامات کی دفعات لگا دے گی۔ غرض یہ کہ اگر آپ کی بیوی حوّا کی صحیح جانشین
ہے تو آپ کا گھر ہمیشہ عدالت یا پانی پت کا میدان بنا رہے گا۔

کبھی کبھی ہر شوہر کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی بیوی بڑی
وفا شعار اور قدردان ہے۔ شوہر کو اتنا عزیز رکھتی ہے کہ اسے ہر عورت اپنی
رقیب دکھائی دیتی ہے۔ عزیز ترین سہیلیوں پر بھی اسے مطلق بھروسہ نہیں۔ یہاں
وہ ہوتی ہیں شوہر کو پر نہیں مارنے دیتی اور اگر اس محبت کے عوض اسے رشک آتا
ہے تو شوہر کو چاہیے کہ وہ اپنے تئیں خوش نصیب جانے۔ لیکن بھرم اُس وقت ٹوٹ
جاتا ہے جب شوہر بیوی کی زبانی یہ بھی سُننے پر مجبور ہو کہ ان دونوں کے درمیان
جو رشتہ ہے وہ محض ایجاب و قبول کا مرہونِ منت نہیں اس میں بیوی کے اقرباء
کی عقلِ کوتاہ اور شوہر کے احباب کے دستِ رسا کو بھی پورا پورا دخل تھا۔ بیوی
یہ ماننے کو مشکل ہی سے تیار ہوتی ہے کہ اگر اسے انتخاب کا حق دیا جاتا تو وہ شوہر
جیسے گاؤدی اور نااہل آدمی کو برضا و رغبت قبولیت کا شرف بخشتی اور خدا کا

شکر بجا لاتی۔ اسے اس رشتہ کی استواری پر جتنا اصرار ہوتا ہے اتنا ہی اپنے بخت کی نارسائی کا شکوہ بھی ہوتا ہے۔

اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

دنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ ایک مخصوص عمر تک پہنچنے پر وہ آپ کا اعتبار کرنے لگتی ہے۔ بہر حال عمر کے ساتھ آدمی کے کردار میں پختگی آتی ہی ہے، مگر بیوی اس کلیہ سے بری ہے، آپ خواہ بوڑھے ہو جائیں۔ سٹھیا جائیں یا سیتر بہتر ہے ہوں، اگر آپ کی رفیق حیات کا سہاگ باقی ہے تو وہ اس کے تحفظ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے گی۔ اس کے لب پر ہر دم یہی دعا رہے گی کہ خدا پہلے اس کا پردہ ڈھک لے پھر آپ کی باری آئے۔ عمر بھر جنت کے قصے سنا گئے اور میاں کی رنگیلی طبیعت سے بھی واقف ہیں پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ انھیں حور و غلماں کے بیچ تنہا بھیج دیں۔ خدانخواستہ وہاں کوئی ایسی ویسی مل گئی تو خود اس کی مٹی کیوں کر عزیز ہوگی اس لئے پہلے سے جاکر حالات سازگار رکھنا چاہتی ہے، اور آپ کو داغِ مفارقت دینے پر تلی بیٹھی ہیں۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالبؔ
وہ کافر کہ خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

شاید کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جن کی بیویاں شک کی جبلت سے محروم یا عاری ہوں وہ یہ تقریرسُن کے بڑے خوش ہوتے ہوں گے۔ جی تو چاہتا ہے کہ انھیں رشک کی نگاہ سے دیکھا جائے مگر بات کچھ اور ہی ہے۔ بیوی اگر شکّی نہ ہو تو زندگی کا لطف آدھا رہ جائے۔ حقیقت کے ساتھ ساتھ زندگی کو رومان کی بھی ضرورت ہے۔

آپ خواہ اپنے بارے میں خود یہ فیصلہ کریں کہ اب آپ کی قیمت حسینوں کی نگاہ میں گر گئی ہے لیکن اگر کوئی شخص ایسا بھی ہے جو آپ کو یہ احساس دلاتا ہے کہ آپ پہ ہر گھڑی، ہر لمحے ہزاروں نگاہیں مرکوز رہتی ہیں۔ آپ کو اندر کے اکھاڑے کی کوئی پری کسی وقت بھی اُٹھا کر لے جا سکتی ہے، تو خدارا اس شخص کی قدر کیجئے اور اسے جان سے زیادہ عزیز رکھئے موت انسان کی بے بضاعتی کا نام ہے۔ توبہ توبہ اگر آپ کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے کہ اب آپ کی جانب کوئی نگاہ نہیں اُٹھتی۔ آپ کا کوئی طلب گار نہیں۔ آپ کے جلال اور جمال کا جادو قصہ پارینہ ہوا اور آپ بقول میر بس ایک توکری مٹی کو ڈھو رہے ہیں تو جیتے جی دم نکل جائے گا۔ ہماری بیوی شکی سہی۔ زبان کی پھوہڑ سہی۔ بلائے جان اور بے درمان سہی مگر ہماری ہر ہر ادا تو دیکھتی ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں میں رومان کا رنگ تو بھرتی ہے۔ ہم اس کے اس احسان کو بھلا کیوں کر بھول سکتے ہیں، اس لئے جب بھی اس نیک بخت کا خیال آتا ہے دل سے یہی دعا نکلتی ہے:

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

▲

ہم ایک "میاں" ہیں

شادی کرنا ایک مبارک و مستحسن کام ہے۔ اللہ ہر نوجوان کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ یہی طریقہ آدمیت کی بقا کا از آدم تا ایں دم چلا آتا ہے۔ شوہر بننے میں بھی کچھ مضائقہ نہیں، یہ شادی کا لازمی ثمر ہے البتہ جہاں تک ہوتا ہو آدمی میاں بننے سے گریز کرے۔ ہم ایک میاں ہیں اور ہماری دعا یہ ہے کہ اللہ ہمارے دشمن کو بھی میاں نہ بنائے۔

ازدواجی زندگی کا سب سے زیادہ رومانٹک دور تو وہ ہوتا ہے جب کوئی کسی کا دولہا کہلاتا ہے۔ دولہا ایک الف لیلوی کردار ہے جس پہ کنواروں کو تو رشک آتا ہے اور کنواریاں اپنا سب کچھ نثار کرنے کو تیار رہتی ہیں۔ دولہا کو شہر ممنوعہ کا کولمبس سمجھئے وہ ظلمات سے بے رہنمائی خضر آبِ حیات لاتا ہے۔ اس کی نگاہ، رنگ روپ اور جسم کے رونئیں رونئیں سے آسودگی کی شعاعیں پھوٹی پڑتی ہیں۔

ارشمیدس کے "پالیا" کی صدا آتی ہے۔ دولہا سے دلہن اس طرح ڈرتی ہے جیسے بچہ آگ سے ڈرتا ہے۔ ہُوہو کرتے ہوئے بھی ہر دم چھونے کے لئے تیار۔ دولہا کو سسرال والے یوں ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، جس طرح رام کا بن باس سے لوٹنے پر اجودھیا کے باسیوں نے استقبال کیا تھا۔ یہ دَور دلہن کے لئے بھی اگنی پریکھشا سے کم نہیں ہوتا۔ ان دِنوں وہ اس طرح جیتی ہے کہ اگر اسی کو اپنا شعار بنالے تو دولہا محض رسمی طور پر نہیں واقعتاً اس کا غلام ہو جائے۔ ایک چاند سا چہرہ رنگین آنچل سے یوں جھانکتا ہے جیسے وہ ازلی مسرتوں کا سرچشمہ ہو۔ ؎

پھرتی ہیں وہ نگاہیں پلکوں کے سائے سائے

پھر ایک دن کوئی راکشس سیتاہرن کو آتا ہے اور دلہن آن کی آن میں بیگم بن جاتی ہیں۔ دُلہن کا گھونگھٹ اُٹھتے ہی دولہا بے چارے پر چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ اور ساس، نند، دیور جو دُلہن کے سامنے آتا ہے، جلووں کے اژدہام سے حیران رہ جاتا ہے۔ اس افراتفری میں نہ جانے کب اور کیسے دولہا غریب پہلے خاوند اور پھر شوہر ہو جاتا ہے۔ بات یہاں تک رہے تو بھی خیر غنیمت ہے۔ بہاروں کے بعد خزاں کا آنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے البتہ جب خزاں تسلط اختیار کرے اور آئندہ بہار کی امید بھی نہ رہے تو انسان کا جی گھبرا اُٹھتا ہے

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

آدمی اس مقام پر سنبھل جائے تو جانئے اسے ایک نئی زندگی ملی ہے۔ مگر ہوتا عموماً یوں ہے کہ وہ جتنے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اتنا ہی ڈوبتا چلا جاتا ہے

اور جب کچھ دن بعد اس گرداب بلا سے نکلتا ہے تو "میاں" ہوتا ہے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

دولہا پر دلہن کو یہ شک ہوتا ہے کہ وہ اس سے زیادہ کسی اور کو پسند کرتے ہیں۔ اس لئے جیبوں میں خط ٹٹولے جاتے ہیں۔ ٹیلیفون پر کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے دوستوں کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے۔ اور ہر دم یہ کوشش ہوتی ہے کہ دولہا کا قلب و نظر شکار کیا جائے۔ صید کی یہ صیادی سچ پوچھئے تو بڑا مزا دیتی ہے۔ پھر جب دولہا دام میں آتا ہے تو خاوند ہو جاتا ہے۔ خاوند پرا زسر تا پا آقائیت برستی ہے۔ اس میں دولہا کی ذات کا رومان نہیں ہوتا۔ شوہر ایک عبوری دور کی شخصیت کا نام ہے۔ اس دور میں مرد کے مالکانہ حقوق تحلیل ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور میاں بنتے ہی تو آدمی عورت کے لئے مقبوضات کا درجہ رکھتا ہے۔

جیدھر اٹھیں وہ ابرو ادھر نماز کرنا

پرانی داستانوں میں کچھ جادوگرنیوں کا ذکر ملتا ہے۔ وہ جسے چاہتی تھیں طوطا مینا بنا پنجرے میں بند کر لیتی تھیں۔ کوہ قاف سے پرے اندھے کنویں میں قید کرتی تھیں یا پھر ایسا منتر پڑھتی تھیں کہ آدھا دھڑ پتھر کا ہو جاتا تھا۔ آدمی جیسے بیٹھا ہے بس ایسے ہی بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ بڑی بوڑھیاں عورت کو کالے سر والی کہتی ہیں۔ جو ان کے سحر میں پھنسا اس کا چھوٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے "کالے کے آگے کس کا چراغ جلتا ہے"۔ شاستروں میں لکھا ہے "تریا چرتر پرشش بھاگیم دیو دنہ جانا تی کتو منشیہ" آدمی ایک بار میاں بن جائے،

استری ورتا ہوجائے تو سمجھئے اس نے دشتِ سحر میں قدم رکھ لیا۔ اب جیتے جی وہاں سے نکلنا مشکل ہے۔

گیا سو اس کی گلی میں گیا نہ بولا پھر
میں میرؔ میرؔ کر اس کو بہت پکار آیا

میاں کا منصب کچھ ہندوستانیوں ہی کا مقدر نہیں، مشہور یونانی فلسفی سقراط بھی میاں تھے ان کی شریک حیات نے ان کا زیست کرنا مشکل کر دیا تھا سنا ہے ایک بار وہ بیگم کی صلواتیں سنتے سنتے عاجز آ گئے تو گھر سے نکل دروازے پر آ بیٹھے، کچھ دیر بعد جب یہاں بھی ان کے سر پر پانی کا گھڑا الٹا گیا تو وہ مسکرا کے یوں گویا ہوئے "مجھے معلوم تھا کہ گرج کے بعد چھینٹا بھی پڑتا ہے۔" مومنؔ نے اللہ انھیں غریق رحمت کرے، سقراط کے اس تجربے کو منظوم کر دیا ہے ؎

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

غالبؔ تمام عمر بیوی کے شکوے کرتے رہے۔ ایک مرتبہ بیوی کو زادِ راہ زنداں میں چھوڑ معہ دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگے تو پکڑے ہوئے لائے گئے اور یار آخر عہد کیا کہ اب نہیں بھاگوں گا۔ البتہ دوستوں کو ان کی آزادی پر مبارک باد بھی دی اور اپنے لئے دعا بھی کرتے رہے:

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

اطاعت کی ایک منزل تو یہ ہے کہ آدمی پر جو کچھ گزرے اسے خاموشی سے برداشت کرلے اور حرفِ شکایت زبان تک نہ لائے۔ تسلیم کی خو ڈالے۔ اور

ایک منزل اس سے بھی آگے کی ہے۔ یعنی آدمی پر خواہ کیسا ہی جانکاہ صدمہ گزرے وہ اس میں خوشی محسوس کرے۔ آفریں و مرحبا کہے۔

عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

دراصل یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر دولہا میاں فقط "میاں" رہ جاتے ہیں۔ ؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

میاں کی محرومی یہ ہوتی ہے کہ انھیں ساری دنیا سے الگ بلکہ نظربند کر فقط بیوی کا ہونا پڑتا ہے۔ میاں کے وجود و عدم موجود کا سلسلہ بڑا اعتباری ہوتا ہے۔ دروازے پر کسی رفیق ہمدم نے آواز دی اور وہ موجود سے لاموجود ہوئے۔ ٹیلیفون پر دوسری طرف ان کا نام لیا گیا اور انھیں مجرم کی طرح گھر سے غائب کیا گیا۔ دیرینہ دوست بیچارے اس مفارقت جاودانی کے سبب بے گانہ ہو گئے اور میاں غریب اتنی بڑی دنیا میں یک بارگی تنہا رہ گئے۔ ذوقِ جمال اور حسن شناسی کو اس درجہ زوال ہوتا ہے کہ اچھے بھلے چہرے دیکھنے سے جی اکتاتا ہے۔ خواب میں بھی سدا ایک ہی صورت دکھائی دیتی ہے۔ بے، بے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ طبیعت بُری طرح گھبراتی ہے۔ چشم بد دور یہی ایک حورہ آفات جاودانی ہے اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔

دشمن پہ بھی اللہ یہ افتاد نہ ڈالے

بیویاں خدا انھیں سلامت رکھے، ان دقتوں کے اٹھانے پر بھی، میاں کے نام سے یوں شرماتی ہیں۔ جیسے خدانخواستہ وہ کوئی ارذل و اسفل مخلوق ہوں۔ بیوی کی نظر میں بیا

کا سب سے نگاوڑی، بدشکل اور مفلس انسان وہ ہوتا ہے جس سے میرے منہ میں خاک اس کا نصیبہ پھوٹے۔ چنانچہ وہ دوسروں سے تعارف کراتے وقت وہ بڑی عونت سے میاں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں "یہ میرے میاں ہیں"۔ گویا اگر ان سے نسبت نہ ہوتی تو میاں بیچارے کچھ بھی نہ ہوتے یا خدانخواستہ وہ نہ رہیں گی تو میاں کے وجود کو سرے سے تعارف کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

ہم ان کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

میاں بیچارے کے دل پر جو گزرتی ہے ہرچند وہ سب سمجھ جاتے ہیں، مگر ایسے موقعوں پران کا جی یہ چاہتا ہے کہ جھٹ اپنی بیوی کو فارغ خطی دے کر ہمیشہ کے لئے اس میاں پن سے نجات پائیں۔ ؎

قلزم دہر میں رکھتا ہے تحیر محفوظ

غرق کم ہوتا ہے دریا میں سفینہ خالی

ہم ایک میاں ہیں اور ہماری بیوی شکوے شکایتوں کا پڑا مانتی ہے۔ خالم مانے اور روئے نہ دے۔ بہرحال ہم بھی حتی المقدور اپنی زبان بند ہی رکھتے ہیں آج نہ جانے کیسے جرأت ہوئی کہ دل کے پھپھولے پھوڑے اور ذرا غبار نکالا ہے۔ اب ہوش آیا ہے تو دست بستہ معذرت کئے بیٹھے ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

اُف کے گنہگار ہم ہیں تو مگر خطا معاف

آنکھ بھر کے در روتے دل ہی تو تھا دکھا دیا

آنگن ٹیڑھا

ناچ نہ آوے پر ایک معصوم نے معصوم سا عذر پیش کیا تھا۔ کسی بے درد نے
اسے پھبتی بنا دیا اور اس طرح تک یہ رسم چلی آئی ہے کہ اگر آپ کسی مہم میں خدانخواستہ ناکام
ہو جائیں تو سیدھے سادے اعتراف شکست سے ہی بات ٹھکانے سے ہے ورنہ اگر
آپ کتنا ہی معقول عذر کریں، اعتراض کرنے والے کچھ نہ کچھ پھبتیاں کسے بنا نہ رہیں گے۔
لطف یہ ہے کہ اگر ان سے خود ان کی کارگزاریوں کا جائزہ لیا جائے تو فوراً سے بغلیں
جھانکنے لگیں گے۔ میں سچ کہتا ہوں ان میں بھی اتنی جرأت نہ ہوگی کہ خود کو ناکام کہہ کے
اپنا پیچھا چھڑا لیں۔ البتہ کسی دوسرے کا معاملہ ہو تو پیچھے نکل جانا ہنستا ہے۔ بات
یہ ہے کہ آدمی کی برائی اس کی پیٹھ پر ہوتی ہے۔ اپنا عیب کسی کو نظر نہیں آتا۔ اور
اور اگر کسی دوسرے سے خطا ہو جائے تو سب الم نشرح کرتے ہیں۔ اعتراض
کرنے والوں سے بچنے کا تو بس ایک ہی طریقہ ہے۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیے

اور نشاطِ کار یا لذتِ عمل سے نا آشنا ہو جائیے پھر نہ تو ناکامی ہو گی نہ حاجتِ عذر اور نہ عذر کے بعد آنے والی ناگہانی بلائیں ؎

چرا کارِ کند عاقل کہ بعد آید پشیمانی

کانن ڈائل کے مشہور کردار شرلک ہومز سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ کن کن علوم سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اس نے جواب دیا: "میں زہروں اور جرائم کے بارے میں خوب جانتا ہوں اور ساتھ ساتھ زندگی کے دوسرے شعبوں سے عدم واقفیت کا اعتراف کرتا ہوں۔

سقراط اتنا بڑا فلسفی ہونے کے باوجود بیوی کے مزاج پر قابو نہ پا سکا تھا اور اس نے اس میدان میں شکست تسلیم بھی کر لی تھی۔

آئنسٹائن جیسا حساب داں کبھی پیسوں کا شمار نہ کر سکا اور وہ بھی اپنی اس محرومی کا معترف تھا۔

مگر ان چند مثالوں کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کرنا کہ ہر انسان جو کچھ نہیں جانتا اُس کا اقرار بھی کرے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا ہم اور آپ بھلا یہ کیسے تسلیم کریں کہ زندگی کا کوئی گوشہ ہماری نگاہِ دور رس سے پوشیدہ بھی ہے۔ ان کی بات اور تھی۔ وہاں تو ایک طرف کمال تھا اور دوسری طرف عجز۔ ان کے کارنامے ان کی محرومیوں کے باوجود اُن کی شخصیت کا لوہا منوانے کے لئے کافی تھے۔ البتہ ہم بیچارے جنھیں سچ پوچھئے تو کچھ نہیں آتا کیا اپنے جہل اور عدم واقفیت کا اعلان کر کے دُنیا کی ملامت کا نشانہ بن جائیں۔

کوئی بُرا کہے یا بھلا ہمیں تو یہی زیب دیتا ہے کہ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی ہر میدان

ہیں خود کو یگانۂ روزگار، بے مثال کہیں اور بلند بانگ دعوے کئے جائیں۔
ہر فن میں ہوں طاق مجھے کیا نہیں آتا۔

اب رہا اظہار یا ثابت کرنے کا سوال تو اس کے لئے ہزار بہانے ہیں۔ عذر و معذرت ہیں، پیش بندیاں ہیں اور نہ جانے کتنے طریقے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور خیال رکھئے کہ پہلے تو لئے پھر بولئے۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم نے ایسے ہزاروں آدمی دیکھے ہوں گے جو نِرے جاہل ہوتے ہیں اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ انھیں علم و ہنر کے ہر شعبہ میں دخل ہے۔ آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ۔ فسانۂ آزاد کے خوجی کی طرح "نہ ہوئی قرولی ورنہ آج بھونک ہی دیتا" کہہ کہہ کے اپنی کمزوری کو چھپاتے ہیں اور جھوٹے مُنہ جتاتے ہیں۔ ہم جیسے لوگ تو اپنی غیرت کے مارے ان کے امتحان کا قصد ہی نہیں کرتے۔ خطا کرتا ہے دشمن اور ہم شرماتے جاتے ہیں۔

کچھ لوگ جب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا چاہتے ہیں تو پھر ایسے بہانوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ یہ کہتے ہی بن آتی ہے کہ "ناچ نہ جانوں آنگن ٹیڑھا"۔ نام نہاد عالم کہتے ہیں "مسئلہ ہی دراصل پیچیدہ ہے۔ مصنف" الزام موضوع کے سر تھوپتے ہیں۔ اور مقرر کو سامعین کے سامنے کھڑا کیجئے تو حلق خشک ہو جائیگا۔ زبان لڑکھڑائے گی اور نبضیں چھوٹنے لگیں گی۔ مگر واہ ری ہمت و حوصلہ اس وقت بھی مائک کی خرابی یا ڈائس کی بلندی اور سامعین کی جہالت ہی پہ تان ٹوٹے گی۔ یہ سب جانتے ہیں کہ عذرِ گناہ، بدتر از گناہ۔ مگر کیا کیا جائے۔ ایسے زمانے میں جہاں ہر ایک اپنے تئیں بوجھ بجھکڑ گنتا ہو کسی کو اپنی کوتاہیوں کا اعلان کرکے تماشا

ٹھوکر کی بنا ہے۔

دنیا کا قاعدہ ہے کہ آپ کی کوئی کمزوری اس کے ہاتھ آئے تو وہ ہرگز معاف نہیں کرے گی اور بیٹھے بٹھائے آپ کا جینا دوبھر ہو جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ دھوکا دینا اور فریب کاری بھی۔۔ اچھی بات نہیں ہے مگر ہم اس حد تک ایسے چالاک سمجھتے ہیں جتنا کہ جینے کے لئے ضروری ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ جو ناچ نہیں جانتا وہ ٹیڑھا کیوں ہوتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں جسے کام آتا نہیں وہ اس میں مداخلت کیوں کرے۔ سوال بظاہر معقول نظر آتا ہے مگر اس سے پہلے کہ اس کا جواب دیا جائے مجھے یہ بتائیے کہ انسان جس مقام پر آج ہے کیا ہمیشہ سے وہیں تھا۔ سنا ہے جب آدم و حوا کو جنت سے نکالا گیا تو انہیں کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ بچارے دن رات گریہ و زاری کیا کرتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ ہوش کو مجتمع کیا اور پھر ان ایک جہان تازہ کی تلاش میں لگ گئے۔ اسے انسان کی مسلسل جد و جہد کا ثمرہ ہی تو کہنا چاہئے کہ آج وہ زمین و آسمان کی بے شمار قوتوں پر فتح پا چکا ہے پر تلاش و تجسس آج بھی جاری ہے۔

کہتے ہیں آدمی گانے لگے تو گویا بن جاتا ہے لیکن گویا بننے تک اسے کتنی کٹھن منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ بات کسی گویے ہی سے پوچھئے۔ ریاض کرتے وقت پڑوسیوں کو کیا کیا شبہ ہوتا ہے۔ دوست احباب کو داد تحسین دیتے ہوئے کیسے کیسے صدمے اٹھانے پڑتے ہیں۔ تب کہیں جا کے آواز میں نوا آتی ہے۔ غرض یہ کہ زندگی جرأت کار سے عبارت ہے اور اگر انسان میں جرأت موجود ہے تو ناچ بھی آ جائے گا اور آنگن بھی سیدھا ہوتے دیر نہیں لگتی۔

بشر کو دعویٰ خدائی تو سزاوار نہیں کہ جو اُس نے کہا وہ پورا ہو گیا۔ اُسے تو
قدم قدم پہ ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

نپولین جیسا عظیم انسان بھی متعدد کوششوں کے بعد فتحیاب ہوا تھا۔

انسان اگر اپنی محرومیوں کا ذمہ دار خود کو بتائے تو اُس کے اعتماد کو ٹھیس
لگتی ہے، شخصیت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس لئے الزام کسی غیر کے سر دینا بالکل فطری
اور ناگزیر عمل ہے۔ آدم کی غلطی کا ذمہ دار حوّا کو ٹھہرایا گیا۔ حوّا کا الزام شیطان کے
سر آیا اور بات یہاں بھی اس وجہ سے ختم ہو گئی کہ شیطان غریب کا کوئی حمایتی نہیں
وہ بے چارہ تو ہر ایک کی نظر میں مطعون و ملعون ہے۔ تاریخ میں بزرگوں کی غلطیوں
کا تجزیہ کرتے وقت ہم اکثر اس دور کے حالات پر نکتہ چینی کرتے تھکتے نہیں۔ مختصر یہ کہ
اپنی کوتاہی تسلیم کرنے کا رواج نہ اب ہے کسی دور میں بھی نہیں رہا اور ہمیشہ انسانوں نے
اسے دوسروں سے منسوب کیا ہے۔ آج بھی اس سے بچنے کی کوشش زندگی سے عبارت
مفقود ہو جائے گی۔ اردو کے شعرا کو دیکھئے ہمیشہ سے کہ دل نہیں لگتا۔ رقیب
ناصح، اور فلک پر بھی عمر بھر کے الزام دھرتے تھے۔ یا پھر ایسے مجرم نہیں ہوتی بلکہ محبوب پر پیشے
پر بھی ہزاروں بہتان لگا سکے۔ بد مزاج، بد خو، بے وفا، اور بد زبان، خدا جانے کیا کیا کہا
کوئی ان سے دریافت کرے کہ حضرت جب محبوب ایسا ہے تو پھر رقیب اور زمانہ کیسی؟
آخر آپ کے ہر کسی نے گنتی تو آپ کا دل بہتا ہے۔ آپ کیا کچھ کی زندگی۔ تو یہ ٹھیک
وہ اپنی غلطی تھوڑی مانیں گے۔ محبوب اگر معصوم ثابت ہوا تو کبھی فلک اور کبھی رقیب کی شامت
آئے گی۔ تقدیر کا ماتم ہوگا۔

وحشت کی رات اگر نہ بنی تو بگڑ گئی ﴿ جب تم سے بن گئی تو زمانہ بگڑ گیا

بڑے لوگوں کے رشتہ دار

اگلے لوگ کہا کرتے تھے، اللہ بڑے آدمی سے کبھی واسطہ نہ ڈالے غریب میں سَو عیب سہی، پر اپنایئت تو ہوتی ہے۔ آج جسے دیکھئے وہ بڑائی کا گرویدہ نظر آتا ہے۔ انکساری، تواضع، حلیمی اور خاکساری کسی کو پسند ہی نہیں۔ اکڑ، مکر، غرور، نخوت اور خود پسندی بہ حیثیت سب کا شعار ہو گیا ہے۔ جسے دیکھئے آپ اپنی شان میں قصیدہ خوانی کر رہا ہے۔ مَیں مَیں کی گردان کئے جاتا ہے ایسا لگتا ہے جیسے دنیا میں ان کا ہم پلہ نہ پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔ اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ کسی محفل میں کوئی بھلا مانس کسی کی تعریف کرتا اور موصوف وہاں موجود ہوتا تو شرم سے پانی پانی ہوتا تھا۔ گفتگو کا رُخ بدل کے اِدھر اُدھر کے موضوع نکالتا۔ سینکڑوں کلمے عاجزی اور ہیچ مقداری کے معذرت کے طور پر برجستہ زبان پر آتے۔ من آنم کہ من دانم، حقیر، فقیر، ناچیز، ادنیٰ، نیاز مند کہتے کہتے منہ سوکھتا تھا۔ پر اپنے تئیں بڑا

کھلنا کسی طرح گوارا نہ تھا۔ ان دنوں خاندان، کنبے اور برادری کو بڑی اہمیت
دی جاتی تھی۔ جو جس خانوادے سے تعلق رکھتا تھا، برملا اس کا اظہار بھی کرتا
تھا۔ رشتہ داروں میں اگر غریب اور نادار لوگ ہوتے تو ان کا ذکر سب سے پہلے
کیا جاتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے دل پر میل آ جائے اور وہ یہ سوچنے لگیں کہ ہماری غریبی
کی وجہ سے ہمیں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ دل بدست آور کہ حج اکبر است۔ اب جیسے
دیکھئے مرزا ظاہر دار بیگ بنا ہوا ہے۔ دیہ شیروانی اندر پریشانی۔ کم حیثیت ہونا تو یہ
تو یہ سب سے بڑا گناہ قرار دیا جاتا ہے۔ اگر کسی کے دو چار عزیز مالی اعتبار سے کمزور
رہ گئے تو ان سے ناطہ ہی ٹوٹ گیا۔ وہ بیچارے ٹکے کی ترقی نہ کر سکے اور ان کا نام
رشتہ داروں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ جس کو جہاں پایا۔ جملہ یہ بھی کوئی
عقل مندی ہے کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگایا جائے۔ آدمی اپنی سنگت سے پہچانا
جاتا ہے۔ ان سے میل کا تعلق بھی کیا ہوگا۔ مثل مشہور ہے کہ کسی کے تین نام
[illegible]۔ حسب نسب، قرابت داری اور خاندان سب پرانے وقتوں
کی باتیں ہو گئیں۔ آج کی دنیا میں آپ جس سے ملنا جلنا پسند کریں وہی آپ کا رشتہ دار
ہے۔ اس میں عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ بڑے لوگوں کو اپنایا جائے اور نکموں سے پیچھا
چھڑایا جائے۔ شعر

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

ہر زمانے میں آدمی کا ذوق اور مزاج مختلف رہا ہے۔ کل جن لوگوں میں جو
شوق ہوا کرتے تھے وہ آج نہیں پائے جاتے۔ اور آج جو رجحانات ملتے ہیں
وہ شاید کل معدوم ہو جائیں۔ جس طرح ہمارے بزرگ کنکوے، تیتر اور بٹیر

لڑاتے تھے۔ کبوتر، باز، بہری، اگن، ہزار داستان اور فاختائیں پالتے تھے، اسی
طرح ہم لوگ خیالی طوطے مینا اڑاتے ہیں۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے،
جسے دیکھا کہ اللہ نے دولت، ثروت، منصب اور جاہ و حشمت سے نوازا ہے اسی
کو اپنا کہہ دیا، کچھ اور ہاتھ آیا یا نہیں ہم جیسوں میں تو عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔
ترقی کے اس دور میں بھلا یہ کس کو گوارہ ہو گا کہ اگر وہ بڑا آدمی نہیں ہے تو اس کے
رشتہ داروں میں بھی کوئی بڑا آدمی نہ ہو۔ شوق کا کوئی سبب تو ہوتا نہیں۔ بھلا بتائیے
تو سہی مرغ لڑانے سے کیا حاصل ہوتا تھا، بس جی خوش کرنے کا نام شوق ہے
اب اگر آپ نے کسی مالدار، صاحب حیثیت یا بڑے عہدے دار کو اپنا عزیز کہہ دیا تو
اس میں کیا مضائقہ ہے۔ آپ کے دل کو تسلی ہو گئی۔ چہرے پہ خون جھلکنے لگا۔ آنکھوں میں
چمک نمودار ہوئی اور ذرا سر اٹھا کے چلنے کا موقع مل گیا۔ سچ پوچھئے تو اس میں کچھ
جھوٹ بھی نہیں ہے۔ ہم آپ اور یہ ساری دنیا والے آدم و حوا کی اولاد ہیں،
پھر بھلا کون کسی کی رشتہ داری سے انکار کر سکتا ہے۔ اگر کرے گا تو ایسے ہی کریگا
جیسے آپ اپنے دائرہ اختیار میں کرتے ہیں، لیکن اس میں برا ماننے کی کونسی بات ہے۔
آپ یہ کہہ کے سرخرو ہو جائیں گے کہ ان میں سمائی نہیں ہے۔ سیر کی ہنڈیا میں سوا
سیر پڑ گیا ہے۔ احباب کی دانشمندی یہ ہے کہ آپ کی ہر بات پہ آمنا و صدقنا کہیں
اگر اس میں کوتاہی کی تو پھر ان کے بیان بھی تحقیق کی زد میں آسکتے ہیں۔ تحقیق کو آپ
خواہ کوہ کندن و کاہ برآوردن سے تعبیر کریں یا یوں کہیں کہ کھودا پہاڑ نکلا چوہا
مگر اتنی بات ضرور ماننی پڑے گی کہ اس کی فتنہ سامانیوں سے ہر کسی کو ڈرنا
چاہیے۔

انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ روم میں رہیئے تو رومیوں کی طرح رہیئے آپ کو اس سے کیا سروکار کہ کسی کا کہا صداقت کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہے یا نہیں، آپ ان بڑے لوگوں میں سے جن کا نام لینے پر دنیا مرعوب ہوتی ہے، اپنے عزیزوں کا انتخاب کیجئے اور ان کے نام اس طرح رٹ لیجئے کہ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ان کا ورد آپ کی زبان پر جاری رہے۔ کہتے ہیں کہ جھوٹ اگر مستقل اور بار بار بولا جائے تو پھر وہی سچ کہلانے لگتا ہے۔ اس نکتہ کو گرہ میں باندھ لیجئے آپ کے بھی دن پھر جائیں گے۔

بڑے لوگوں کو اپنا رشتہ دار کہنے کا رواج تو بہت عام ہو گیا ہے مگر اس فن کو چند اہلِ ذوق ہی خوب سمجھتے ہیں۔ اس راہ میں کچھ دشواریاں بھی ہیں، اور سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارے ذہن اونچ نیچ کے تصور سے ابھی پوری طرح آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ اگلے زمانے کے مریضانہ عقائد بھی ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں دبے پڑے ہیں۔ بد باطن اور عیب جو حضرات آدمی کی موجودہ حیثیت ہی نہیں، اس کا ماضی بھی تابناک دیکھنا چاہتے ہیں اور اگر کہیں خدانخواستہ اس اعتبار سے ذرا بھی کمزوری پائی جاتی ہے تو ایسے بڑے لوگوں کو اپنا رشتہ دار بتا کر آدمی نکو بن جاتا ہے۔ لوگ ہم نشینوں پر سبقت لے جانے کے لئے گڑے مُردے اُکھاڑنے پر تیار ہو جاتے ہیں اور ایسی حاسدانہ باتیں کرتے ہیں کہ چپ رہتے بن پڑتی ہے۔ جوابِ جاہلاں باشد خموشی۔ بڑے لوگوں کا رشتہ دار بننے کے لئے ان کے گھر کی مخبری بھی ضروری ہے وہ کیا کھاتے ہیں، وہ کیا پیتے ہیں۔ ان کے یہاں کتنے نوکر ہیں۔ کیا کیا سامان ہے۔ ان کو گھر میں کیا کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ وہ کب بیمار ہوئے اور کیسے صحت نصیب ہوئی۔ کن عزیزوں نے تیمارداری کا فریضہ ادا کیا اور کیا دعائیں پڑھی گئیں۔

کون کون سے وظیفے ہوئے کیا منتیں مانی گئیں - یہ ایسی باتیں ہیں جن کی معلومات دوسروں کو یہ باور کراتی ہے کہ آپ یقیناً درونِ خانہ رسائی رکھتے ہیں اور آپ کی رشتہ داری معتبر اور مصدقہ ہے - بعض سمجھدار لوگ بڑے آدمیوں کے ساتھ تصویر ضرور کھنچوا لیتے ہیں، تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے - تصویریں بھی کئی طرح کی ہوتی ہیں - ایک ایسی تصویر جس میں آپ کے پسندیدہ بڑے آدمی کے ساتھ چند دوسرے لوگ بیٹھے ہیں اور اگر بنظرِ غور دیکھا جائے تو آپ بھی کہیں آڑے ترچھے پھنسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں - اس ہیئت کذائی کے لئے آپ بے تکلفی کا عذر پیش کرتے ہیں اور صورت میں جو بُعد اور مغائرت ہے اس کی ذمے داری ماہ و سال پر آتی ہے - دوسری تصویر وہ ہوتی ہے جس میں بڑے آدمی کے ہمراہ فقط آپ یوں تشریف فرما ہوں جیسے خود کو اُن کا ضمیمہ خیال کرتے ہوں اور عجب سے جنبش مکن کی صدا سُن کر سکتے میں آ گئے ہوں - عبدالرحیم خانخاناں کی دریا دلی اور سخاوت کے بہت سے قصے مشہور ہیں - ایک یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ کوئی اَن گھڑ دیہاتی لوہے کا ایک بڑا سا گولا لیکر خانخاناں کے دربار میں آ گیا اور ان کی آنکھ بچتے ہی چپکے سے وہ گولا ان کے جسم سے چھُوا دیا - خانخاناں نے اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ میں نے سُنا تھا کہ آپ کے دم سے لوہا بھی سونا ہو جاتا ہے - خانخاناں اس جواب پر بہت خوش ہوا اور دیہاتی کو لوہے کے بجائے سونا عطا کیا - شاید ایسا ہی کوئی واقعہ آپ کے ذہن میں بھی ہوتا ہے - کیونکہ تصویر میں آپ کی تمنا "من تو شدم تو من شدی" کی سی دکھائی دیتی ہے -

شادی غمی کی تقریبات میں اگر آپ اور ہم جیسے سینکڑوں لوگ بھی جمع

ہوئے تو کیا مزا آیا۔ ایسے موقعوں پر بڑے لوگوں کی سرپرستی عین سعادت تصور کی جاتی ہے۔ میزبان ان کی تشریف آوری کے لئے کیا کیا جتن کرتے ہیں، اس کا اندازہ تو آپ کو بھی ہوگا۔ دیوانِ عام اور دیوانِ خاص الگ الگ سجائے جاتے ہیں۔ کھانے پینے اور خاطر داری میں بھی سینکڑوں امتیازات ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔ دعوت ناموں میں کسی نہ کسی طرح ان کے نام نامی اور ذاتِ گرامی کا تذکرہ بھی ضرور کیا جاتا ہے۔ مدتوں اُن سے تعلق کا فسانہ دُہرایا جاتا ہے۔ پھر جب وہ قدم رنجہ فرماتے ہیں، تو محفل میں ہڑبونگ مچ جاتی ہے۔ قیامت کا منظر ہوتا ہے۔ کسی کو کسی کا پتہ نہیں رہتا۔ میزبانِ محترم بھری محفل سے بیگانہ اور بے نیاز ہوکر پروانہ وار اس شمع کے گرد چکر لگانے لگتے ہیں۔ ان کی خاطر مدارات، جیا کرچو تحفیے ہوتے ہیں اور آپ یوں بیٹھے رہتے ہیں جیسے یہ تقریب سعید دیکھنے کے لئے ہی آپ کو زحمت دی گئی تھی۔ خدانخواستہ غم کی محفل ہو تو لوگ چاہتے ہیں کہ بڑے آدمیوں کو کندھوں پہ اُٹھا لیا جائے تاکہ سب ان کی شرکت کے عینی شاہد ہوں۔ جنازہ آپ پیچھے پیچھے آجائے گا۔ ایسے موقعوں پر بڑے لوگوں سے تعزیتی پیغامات لئے جاتے ہیں۔ غم انگیز تصویریں کھینچی جاتی ہیں اور مرحوم کی وفات کے بعد ان شواہد کو اس کا سرمایۂ حیات تصور کیا جاتا ہے۔

بڑے لوگوں کا رشتہ دار بن کے آدمی خود بڑا بنے یا نہ بنے اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ لوگ اسے بڑا سمجھنے لگتے ہیں۔ چھوٹے موٹے کی محفلوں میں اس کی آؤ بھگت بھی ہوتی ہے۔ کاروبار اور ضرورت مند لوگ اسے سفارش کا وسیلہ سمجھ کر سلام کرنے لگتے ہیں۔ اور آج کے اس دور میں جب کوئی کسی کا احترام نہیں

کرتا یہ فائدہ کچھ کم نہیں ہے۔ بڑے لوگ اپنے حقیقی رشتہ داروں سے تو پیچھا چھڑا سکتے ہیں، لیکن یہ مجمع جو ان کے شیدائیوں کا ان کے گرد جمع ہو جاتا ہے اس سے چھٹکارہ حاصل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ انھیں چھینک آئے تو یہ عیادت کے لیے آ دھمکتے ہیں۔ تیج تہوار اور خوشی کے موقعوں پر ان کا حاضر ہونا، مصافحہ اور معانقہ کرنا بھی ضروری ہوا ہے۔ غم انگیز تقریبات میں ان سے بڑا ماتم دار نہیں۔ غرض یہ کہ بڑے لوگوں کو بیٹھے بٹھائے اپنے خدمت گار ملتے ہیں اور یہ بیچارے اس خدمت گزاری کو اپنے لیے سعادت تصور کر کے اس پر فخر کرتے ہیں۔

آج کی دنیا میں ہر آدمی اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگا ہے۔ بڑی نفسا نفسی کا عالم ہے۔ دیکھئے تو رشتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، مگر سنجیدگی سے غور کیجئے تو ہر شخص تنہا دکھائی دیتا ہے، کوئی کسی کا پرسان حال نہیں۔ ایسی حالت میں اگر آپ چاہیں کہ آپ کے گرد لوگوں کا میلہ لگا رہے اور سب کا شجرۂ نسب آپ کے بزرگوں سے جا کر ملے تو آپ کوشش کیجئے کہ اپنے آپ کو بڑا آدمی بنائیے اور پھر دیکھئے جب آپ بڑے آدمی بن جائیں تو ہمیں نہ بھلائیے گا۔ ہم بھی آپ کے سانجھے حوا کی ایک ہی پسلی سے پیدا ہوئے تھے۔

ع تم جہاں کے ہو وہاں کے ہم بھی ہیں